بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٰہی خلعت ہفت پارچہ حواس خمسہ و عقل و روح سے سرفرازی دی ہے تو منصب ایمانداری بھی عطا کر کہ خطاب اَشرَفُ المَخلُوقات میری حالت کے مناسب ہو۔ خداوندا اپنے حبیبؐ کا اُمتی بنانے سے امتیاز بخشا ہے تو تقرب عبادت بھی نصیب کر کہ الطاف کریمانہ شفاعت اور عواطفِ خسروانہ رحمت کی مجھ کو قابلیت ہو۔ آدمی اگر اپنی حالت میں تامل صحیح کرے تو اس سے زیادہ عاجز و درماندہ و مبتلا کوئی مخلوق نہیں ہے

گرت[1] چشم خدا بینی ببخشند
نہ بینی ہیچکس عاجزتر از خویش

کل ساٹھ یا ستر برس تو باعتبار اوسط اُس کی میعاد حیات اور اُس کی مدت قیام و ثبات ہے، وہ بھی شروع سے آخر تک ہر لحظہ عرضۂ خطر ہر لمحہ ہدفِ[2] آفت۔ آدھی عمر تو وہ سونے اور کاہل اور بیکار پڑے رہنے میں ضایع کر دیتا ہے باقی بچے ۳۰ یا ۳۵ برس اسی میں اُس کی

۱ اگر تجھے ایسی آنکھیں دی جائیں کہ خدا دکھائی دینے لگے تو سمجھ لے کہ تو ہی عاجز ہے ۲ یعنی نشانہ

طفولیت[۱] ہے اور اسی میں اُس کی جوانی اور پیری کم ہے کم دس، برس طفلی اور درماندگی علالت و پیری کے بھی سمجھ لینے چاہئیں غرض ساری زندگی میں ۲۰ یا ۲۵ برس کام کاج کے دن ہیں مگر کتنے کام کتنی ضرورتیں کس قدر بکھیڑے، کیسے جھگڑے، خدا کی پرستش، مذہب کی تلاش، کسب کمال، فکر معاش، بزرگوں کی خدمت، اولاد کی تربیت، بیماروں کی عیادت، احباب کی زیارت، تقریبات کی شرکت، شہروں کی سیر، ملکوں کی سیاحت، مردوں کا رونا، جُدائی کا ماتم، مولد کی خوشی، ملاقات کی فرحت، دفع مضرت، جلب منفعت، گزشتہ کا احتساب، آیندہ کا انتظام، مسرتِ بہبود، ہوسِ نام و نمود، تاسف نقصان، حسرتِ زیان، تلافیِ مافات، پیش بینی، ماہوآت[۲]، دوستوں سے ارتباط، دشمنوں سے احتیاط، آبرو کا حفظ، ناموس کا پاس، مال کی نگہداشت، محاصل کا احراز

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

اس ضیق فرصت پر کاموں کا اتنا ہجوم یعنی فراغ دل مفقود، اطمینان خاطر معدوم ؎

فکرِ معاش ذکرِ خدا یادِ رفتگان
دو دن کی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے

ایک عقل اور دُنیا بھر کی ذمہ داری، سچ کہا ہے۔ ع

[۱] بچپن کا زمانہ [۲] آئندہ آنیوالا۔ مستقبل۔

یک عشق و ہزار گونہ خواری

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا ۙ اس کتاب میں انسان کے اُس فرض کا مذکور ہے جو تربیت اولاد کے نام سے مشہور ہے اس کتاب کے تصنیف کرنے سے مقصود اصلی یہ ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقع ہو رہی ہے اُس کی اصلاح ہو اور اُن کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ تربیتِ اولاد صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کر دیا روٹی کمانے کھانے کا کوئی ہنر اُن کو سکھا دیا، اُن کا بیاہ برات کر دیا بلکہ اُن کے اخلاق کی تہذیب اُن کے مزاج کی اصلاح اُن کے عادات کی درستی اُن کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے افسوس ہے کہ کتنے لوگ اس فرض سے غافل ہیں کوئی شخص تربیت اولاد کے فرض کو پورا پورا ادا نہیں کر سکتا تا وقتیکہ وہ خود اپنی شایستگی کا نمونہ اُن کو نہیں دکھاتا اور اولاد کے ساتھ اپنا برتاؤ محتسبانہ طور کا نہیں رکھتا پرلے سرے کی بیوقوفی ہے اولاد کو اپنے

لہ کہ ہم نے امانت (عقل) کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے اس کے اُٹھانے سے پہلوتہی کی اور اُس سے ڈر گئے اور انسان نے اُس کو اُٹھایا کچھ شک نہیں کہ بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی نادان تھا۔

کردار ناسزا کی بُری مثالیں دکھانا اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ یہ لوگ بڑے ہو کر زبانی پند یا کتابی نصیحت پر کاربند ہو کر صالح اور نیک وضع ہوں گے بہت لوگ اولاد کے ساتھ غایت درجے کی شیفتگی پیدا کر لیتے ہیں اور بمصداق وَحُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ[1] اولاد کے عیوب پر آگہی نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے تو عیب کو عیب سمجھ کر نہیں یا مقتضائے عمر یا نتیجۂ ذہانت یا دوسرے طور پر اُس کی تاویل کر کے اُن کی خرابیوں سے درگزر اور چشم پوشی کیا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی غلطیوں پر لوگوں کو تنبیہ ہو۔ یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح یقین کرا دے گی کہ تربیتِ اولاد ایک فرض موقت ہے یعنی لڑکے جب تک کم سن ہیں تربیت پذیر ہیں اور بڑے ہوئے پیچھے اُن کی اصلاح مشکل یا متعذر بلکہ محال ہو جاتی ہے۔ ارادہ یہی تھا کہ بلا تخصیص مذہب تلقینِ حسنِ معاشرت اور تعلیم نیک کرداری و اخلاق کی ضرورت لوگوں پر ثابت کی جائے لیکن نیکی کو مذہب سے جُدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بُو کو گل سے، نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علیحدہ اور منفک[2] کرنے کا قصد کرے، اِدھر تو انضمامِ مذہب ایک امرِ ناگزیر ہے۔ اور اُدھر اختلافِ مذہب جو اس مُلک میں اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ گویا ہر کوڑی آدمی ایک جُدا مذہب رکھتے ہیں ہر شخص آنکھیں دکھا رہا ہے لوگوں میں بلا کا تعصب آگیا ہے کہ

[1] کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے [2] یعنی جُدا کرنے کا ارادہ

کیسی ہی اچھی بات کیوں نہ کہی جائے دوسرے مذہب والے اُس کی طرف
متوجہ نہیں ہوتے جَعَلُوْٓا اَصَابِعَھُمْ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ[1] کا مضمون جس کو میں نے ایک
فرضی قصے اور بات چیت کے طرز پر لکھا ہے مذہبی پیرائے سے تو خالی نہیں
اور خالی ہونا ممکن نہ تھا لیکن تمام کتاب میں کوئی بات ایسی بھی نہیں
ہے جو دوسرے مذہب والوں کی دلشکنی اور نفرت کا موجب ہو بلکہ جہاں
جہاں ضرورۃً مذہبی تذکرہ آگیا ہے وہ ایسے طور کا ہے کہ دوسرے
مذہب والے بھی اس طرح کے عقیدے رکھتے ہیں۔ صرف اصطلاح
و عبارت کا تفرقہ ہے وَلَا مُشَاحَةَ فِی الْاِصْطِلَاحِ مثلاً مسلمانوں کی
نماز وہی ہندوؤں کی پوجا پاٹ ہے مسلمانوں کا روزہ ہندوؤں کا برت
مسلمانوں کی زکوٰۃ ہندوؤں کا دان پُن وقس علیٰ ہذا[2] پس یہ قصہ اگرچہ
ایک مسلمان خاندان کا ہے مگر بتغیر الفاظ ہندو خاندان بھی اس سے
مستفید ہو سکتے ہیں، خاندان جو فرض کیا گیا ہے اُس میں دو میاں
بی بی ہیں۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی تو پکّی[3] عمر
کے ہیں اور بیاہے جا چکے ہیں اور لاجرم اُن کی عادتیں راسخ اُن کی
خصلتیں کا لطبیعۃ ہیں منجھلا بیٹا اگرچہ عمر اُس کی بھی کم نہیں ہے لیکن
اس نے مدرسے میں تعلیم پائی ہے اور وہ صرف توجہ کا محتاج
ہے جیسے گھوڑا کہ بے راہ چلا جا رہا ہے اس میں رفتار پیدا کرنے کی

[1] کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں [2] یعنی اسی پر دوسری باتوں کو قیاس
کرو [3] پکّی۔

ضرورت نہیں فقط باگ کا موڑ دینا کافی ہے۔ منجھلی لڑکی کم سن ہے وہ عمر کے اُس درجے میں ہے جبکہ بچوں کی قوّتِ تفتیش[1] و تلاش بہت تیز ہوتی ہے اور نقل کرنے کا شوق اُن کے دلوں میں برسر ترقی ہوتا ہے وہ بھولے پن سے اس طرح کے سوالات کرتی ہے اور سادہ دلی سے ایسی ایسی باتیں پوچھتی ہے کہ ماں قائل ہو ہو جاتی ہے۔

جس طرح پر اس خاندان کے لوگ زندگی کرتے ہوئے فرض کیے گئے ہیں وہ ایک سچا بلا تصنع نمونہ ہے اس زمانہ کے ہر ایک خاندان مدعی شرافت کے طرز ماند و بود کا ایسا فرض کیا گیا ہے کہ رئیس البیت یعنی خاندان کا سرگروہ جس کا نام نصوح ہے ایک وبائی ہیضے میں مبتلا ہوا اور اُس کی حالت اس قدر ردی ہوتی گئی کہ اُس کو اپنے مرنے کا تیقن کرنا پڑا اور چونکہ اُسی وبا میں چند روز پہلے اسی گھر کے تین آدمی مر چکے تھے اور شہر میں موت کی گرم بازاری تھی تو ایسی حالت میں نصوح کا اپنی نسبت موت کا تیقن ایک معمولی بلکہ ضروری بات ہے نصوح کو ڈاکٹر نے جو اس کا معالج تھا خواب آور دوا دی تھی وہ سو گیا، اور اُس کے اگلے پچھلے خیالات ایک خواب بن کر اُس کے سامنے آموجود ہوئے۔ خواب جو نصوح نے دیکھا تمام قصّے کی جان ہے۔ حشر اور اعمال نامہ اور حساب قبر کی تکلیف اور دوزخ کا عذاب یعنی قیامت کے حالات جن کا وہ اپنے مذہبِ اسلام کے مطابق معتقد تھا خواب میں اُس کو

[1] جستجو۔

واقعات نفس الامری دکھائی دیے۔ جاگا تو خائف و ہراساں، بیدار ہوا تو ترساں و لرزاں، خوف کا نتیجہ اور ہراس کا اثر جو نصوح پر مترتب ہوا قصے کے پڑھنے سے ظاہر ہوگا۔ اُس نے نہ صرف اپنے نفس کی اصلاح کی بلکہ سارے خاندان کی اصلاح کو اپنے ذمہ فرض و واجب سمجھا۔ چونکہ خاندان کے چھوٹے بڑے سب اس طرز جدید سے ناآشنا تھے کنفسٍ واحدۃٍ[1] نصوح کے مقابلے پر کمربستہ ہوگئے اور اُس کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں۔ چونکہ نصوح کے ارادے میں استحکام تھا اور وہ حق کی جانبداری کرتا تھا وہ غالب آیا مگر بمشکل ہے۔ اُس کو ظفر ہوا مگر دشواری سے۔ اولاد میں جو جتنا عمر رسیدہ تھا اُسی قدر عسیر[2] الانقیاد تھا۔ تربیتِ اولاد جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے ایک شعبہ[3] ہے اُس عام انسانی ہمدردی اور نفع رسانی کا جو ہر فرد بشر پر اُس کی استطاعت کی قدر واجب ہے اس خصوص میں جتنی غفلت اور بے پروائی ہمارے ہموطنوں سے ہوتی ہے اصلی باعث اس ملک کے تنزل کا ہے، لوگ مضمون ہمدردی سے اس قدر ناواقف ہیں کہ اس خصوص میں اُن کو بچوں کی طرح تعلیم کی حاجت ہے یہ کتاب اس تعلیم کی ابجد ہے اس واسطے کہ ایک انگریزی مثل کے مطابق خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے اگر اولاد اور خاندان کی اصلاح انسان کے ذمہ واجب ہے تو ضرور اُن لوگوں کی اصلاح کا بھی وہ ذمہ دار ہے جو متعلق خدمت

Charity begins from Home.

[1] ایک ذات کی طرح [2] دشوار از روے تابعداری کے [3] شاخ ۱۲

اُس کی نگرانی اور حکومت میں ہیں پھر خدم[1] و عبید[2] کے بعد اَلْاَقْرَبُ[3] فَالْاَقْرَبُ کے لحاظ سے ہمسائے پھر اہل محلہ پھر اہل شہر پھر ہموطن اور ہم مُلک پھر ابنائے جنس[4] ؎

بنی آدم[5] اعضائے یک دیگر اند

کہ در آفرینش زیک جوہر اند

غرض ہمدردی کا ایک بڑا وسیع مضمون ہے مگر بالفعل اُس کے ابتدائی اور ضروری حصے سے آغاز کیا گیا ہے وَاللّٰہُ[6] وَلِیُّ التَّوْفِیْقِ ٥

نذیر احمد وَفَّقَہُ[7] اللّٰہُ التَّزَوُّدَ لِغَدٍ

---

[1] خادم کی جمع [2] عبد کی جمع یعنی غلام [3] اوّل قریب ترین پھر قریب تر پھر قریب والے رشتہ دار وغیرہ [4] اپنی جنس کے بیٹے یعنی تمام انسان [5] تمام آدمی آدم کے بیٹے ہیں اور سب کی اصل ایک ہے [6] توفیق دینا اللہ ہی کے قبضے میں ہے [7] اُسے خدا ایسی توفیق دے کہ فردے کے واسطے زاد راہ ہو جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل اوّل

ایک برس دہلی میں ہیضے کی بڑی سخت وبا آئی،
نصوح نے ہیضہ کیا اور سمجھا کہ مرا چاہتا ہے،
یاس کے عالم میں اُس کو مواخذۂ[1] عاقبت کا تصوّر
بندھا۔ ڈاکٹر نے اُس کو خواب آور دوا دی تھی،
سوگیا تو وہی تصوّر اُس کو خواب موحش[2] بن کر نظر آیا

اب سے دُور ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے
کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے، ایک
بازارِ موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی جس طرف

[1] قیامت کے دن کی بازپرس [2] ڈراؤنا خواب ۱۲

نگاہ کرو وحشت و پریشانی جن بازاروں میں آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اُجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا اختلاط و ملاقات آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اُٹھا دیں ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس کہنے کو زندہ پر مردہ سے بدتر، دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہا، یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔

مرگِ مفاجات حقیقت میں اُنھیں دنوں کی موت تھی نہ سان نہ گمان اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے مالش کی، پہلی ہی کلّی میں حواسِ خمسہ مختل ہو گئے اِلّا ماشاء اللہ کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا ورنہ جی کا متلانا اور قضائے مبرم کا آجانا۔ پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری دوا دعا جانکنی اور مرنا سب کچھ ہو چکتا تھا۔ غرض کچھ اس طرح کی عالمگیر وبا تھی کہ گھر گھر اس کا رونا پڑا تھا۔ ڈیڑھ دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے ہی دنوں میں شہر کچھ ادھیا سا گیا۔ صدہا عورتیں بیوہ ہو گئیں، ہزاروں بچے

---

[۱] سقّے جو پانی پلاتے ہیں وہ کٹورے بجایا کرتے ہیں [۲] مڑ کر پڑ رہا [۳] مگر جس کو خدا نے چاہا [۴] انہٹ۔ کسی صورت سے نہ ٹلنے والی موت۔

یتیم بن گئے۔ جس سے پوچھو شکایت جس سے سنو فریاد مگر ایک نصوح جس کا قصہ ہم اس کتاب میں لکھنے والے ہیں کہ عالم شاکی تھا، اور وہ اکیلا شکر گزار، دُنیا فریادی تھی اور وہ تنہا مداح نہ اس سبب کہ اُس کو اس آفت سے گزند نہیں پہنچا، خود اس کے گھر میں بھی اکٹھے تین آدمی اس وبا میں تلف ہوئے اچھی خاصی طرح گھر بھر رات کو سو کر اُٹھے، نصوح نمازِ صبح کی نیت باندھ چکا تھا۔ باپ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مسواک کرتے کرتے اُبکائی آئی، ابھی نصوح دوگانہ فرض ادا نہیں کر چکا تھا۔ سلام پھیر کر دیکھتا کیا ہے کہ باپ نے قضا کی۔ اُن کو مٹی دے کر آیا تو رشتے کی ایک خالہ تھیں اُن کو جان بحق تسلیم پایا تیسرے دن گھر کی ماما رخصت ہوئیں۔

مگر نصوح کی شکر گزاری کا کچھ اور ہی سبب تھا، اُس کا مقولہ یہ تھا کہ ان دنوں لوگوں کی طبیعتیں بہت کچھ دُرستی پر آگئی تھیں۔ دلوں میں رقت[1] و انکسار کی وہ کیفیت تھی کہ عمر بھر کی ریاضت سے پیدا ہونی دشوار ہے۔ غفلت کو ایسا کاری تازیانہ[2] لگا تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں سرگرم تھا۔

جن لوگوں نے رمضان میں بھی نماز نہیں پڑھی تھی وہ بھی پانچوں وقت سب سے پہلے مسجد میں آموجود ہوتے تھے جنھوں نے بھول کر بھی سجدہ نہیں کیا تھا اُن کا اشراق[3] و تہجد تک قضا نہیں ہونے پاتا تھا۔

---

[1] دل میں سوز و گداز [2] کوڑا [3] پہر بھر دن چڑھے کی نماز۔

دُنیا کی بے ثباتی تعلقات زندگی کی ناپائداری سب کے دل پر منقش تھی۔ لوگوں کے سینے صلح کاری کے نور سے معمور تھے۔ غرض ان دنوں کی زندگی اُس پاکیزہ اور مقدّس اور بے لوث زندگی کا نمونہ تھی جو مذہب تعلیم کرتا ہے۔

نصوح یوں ہی دل کا کچّا تھا جب اُس نے اوّل اوّل ہیضے کی گرم بازاری سُنی سرد ہو گیا اور رنگت زرد پڑ گئی باسباب ظاہری جو جو تدبیریں انسداد کی تھیں سب کیں، مکان میں نئی قلعی پھروادی، پاس پڑوس والوں کو صفائی کی تاکید کی۔ گھر کے کونوں میں لوبان کی ڈھونی دے دی۔ طاقوں میں کافور رکھوا دیا۔ جا بجا کوئلہ ڈلوا دیا۔ باورچی سے کہہ دیا کہ کھانے میں ذرا نمک تیز رہا کرے۔ پیاز اور سرکہ دونوں وقت دسترخوان پر آیا کرے۔ گلاب، نارجیل دریائی، بادیان، تخم ہنڈی[1]، سکنجبین وغیرہ جو جو دوائیں یونانی طبیب اس مرض میں استعمال کرتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی سب بہم پہنچا لیں تاکہ خدانخواستہ ضرورت کے وقت کوئی چیز ڈھونڈھنی نہ پڑے۔ نصوح نے یہاں تک اہتمام کیا کہ انگریزی دوائیاں بھی فراہم کیں۔ کالراپل کی گولیاں تو وہیں کوتوالی سے لیں کالرا ٹنکچر آلہ آباد میڈیکل ہال سے روپیہ بھیج کر منگوا رکھا۔ آگرے سے ایک دوست کی معرفت کلوروڈائن کی دو شیشیاں خرید لیں۔ ایک اخبار میں لکھا دیکھا کر بنارس میں ایک بنگالی اس

[1] املی

بیماری کا حکمی علاج کرتا ہے اور سرکار سے جو دس ہزار روپے کا انعام موعود ہے اُس کا دعویدار ہوا ہے۔ چھٹی لکھ کر اُس کی دوا بھی طلب کی نصوح کو ایک وجہ تسلّی یہ بھی تھی کہ ایک طبیب حاذق اسی کے ہمسایے میں رہتا تھا۔ گو روسیاہ ہیضے کے توڑنے کے واسطے اتنا سامان وافر موجود تھا مگر آخر نصوح کا گھر بھی فرشتوں کی نظر سے نہ بچا، باپ کی اجل آئی تو دوائیں رکھی ہی رہیں دینے اور پلانے کی نوبت بھی نہ پہنچی کہ بڑے میاں سسکیاں لینے لگے۔ وہ رشتہ کی خالہ کچھ تھوڑی دیر سنبھلی تھیں لیکن وہ کچھ ایسی زندگی سے سیر تھیں کہ انھوں نے خود خبر کرنے میں دیر کی۔ غرض دَوا اُن کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ ماما نے البتہ انگریزی یونانی سب طرح کی دوائیں ڈھکوسیں مگر اُس کی عمر ہو چکی تھی اوّل اوّل نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ ہوا تھا مگر جب وبا کا بہت زور ہوا اور خود اسی کے گھر میں تابڑ توڑ[1] ایک چھوڑ تین تین موتیں ہو گئیں تو ناچار تن بتقدیر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا۔ غرض پورا ایک چلّہ شہر پر سختی و مصیبت کا گزرا۔ نہیں معلوم کتنے گھر غارت ہوئے کس قدر خاندان تباہی میں آ گئے۔ یہاں تک کہ نواب عمدۃ الملک نے ہیضہ کیا۔ کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی اور نماز جمعہ کے بعد دیکھتے ہیں تو جنازہ جامع مسجد کے صحن میں رکھا ہے یوں تو ہزارہا آدمی شہر میں تلف ہوئے مگر عمدۃ الملک کی موت سب پر

[1] پے در پے۔

بھاری تھی - اوّل تو اُن کی ٹکر کا شہر میں کوئی رئیس نہ تھا - دوسرے اُن کی ذات سے غریبوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا تھا گو اُن کے مرنے کا گھر گھر ماتم تھا لیکن لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک[2] ڈالی - کیونکہ معتقدات عوام میں یہ بھی ہے کہ وبا بے کسی بڑے رئیس کے بھینٹ لئے نہیں جاتی - خیر لوگوں نے جو کچھ سمجھا ہو - یوں بھی شورش بہت کچھ فرو ہو چکی تھی اور امن و امان ہوتا جاتا تھا لوگوں نے دُکانیں بھی کھولنی شروع کر دیں اور دُنیا کا کاروبار پھر جاری ہو چلا -

انھیں دنوں نصوح نے اپنی بیوی سے کہا کہ دو مہینے سے چاولوں کو ترس گئے اب خدا نے اپنا فضل کیا - آج زردہ پکواؤ مگر تاکید کرنا کہ چاول کھرے نہ رہیں - شام کو زردہ پکا اور گھر کے چھوٹے بڑے سب نے کھایا اور حسب عادت سو رہے - کوئی پہر رات باقی رہی ہوگی کہ دفعتاً نصوح کی آنکھ کھُل گئی - جاگا تو پیٹ میں آگ پھُنکی ہوئی تھی - اٹھتے اٹھتے کئی مرتبہ طبیعت نے مالش کی، اُس نے ننگے سر جلدی سے صحن میں نکل کر ٹہلنا شروع کیا - خوب کس کر دونوں بازو باندھے - گلے میں توے کی سیاہی تھوپی، عطر کا پھویا ناک میں رکھا اور طبیعت کو دوسری طرف مصروف کیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ حلق تک کوئی چیز بھری ہوئی ہے - بہتیرا ضبط کیا، بہتیرا اٹالا، آخر بڑے زور سے استفراغ[3] ہوا - گھر والے سب جاگ اٹھے، نصوح کو اس حالت میں باہر

[1] مقابلہ [2] یعنی کمی ہوئی [3] قے

بیٹھا ہوا دیکھ سب کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ کوئی پانی اور بیسن لے کر دوڑا۔ کوئی الائچی ڈال پان بنا کر پاس آ کھڑا ہوا، کوئی پنکھا جھلنے لگا نصوح کو تو لا کر چارپائی پر لٹایا اور اب سب لوگ لگے اپنی اپنی تجویزیں کرنے۔ کسی نے کہا خیریت ہے، غذا تھی، کوئی بولا زردے میں گھی بُرا تھا، کوئی کہنے لگا کھرچن کا فساد ہے، غرض یہ صلاح ہوئی کہ ہیضہ وبائی نہیں ہے۔ گلاب اور سونف کا عرق دیا جائے اور گھبرانے کی بات نہیں۔ صبح تک طبیعت صاف ہو جائے گی۔

خیر یہ تو تیمارداروں کا حال تھا، نصوح اگرچہ تکان کی وجہ سے مضمحل ہو گیا تھا مگر ہوش و حواس سب خدا کے فضل سے برجا تھے سب کی صلاحیں اور تجویزیں سُنتا تھا اور دوا جو لوگ پلاتے تھے پی لیتا تھا لیکن استفراغ ہونے کے ساتھ ہی اُس نے کہہ دیا تھا کہ لو صاحب "خدا حافظ" ہم بھی رخصت ہوتے ہیں۔ استفراغ امتلائی مجھ کو بارہا ہوئے ہیں مگر اِس وقت میرا جی اندر سے بیٹھا جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں میں سنسنی سی چلی آتی ہے، اتنا کہنے کے بعد تو نصوح دوسری ہی اُدھیڑبن میں لگ گیا اور سمجھا کہ بس دُنیا سے چلا۔ صبح ہوتے ہوتے رداءت[1] کے کل آثار پیدا ہو گئے۔ بردِ اطراف[2] تشنج[3]، ضعف، متلی، اسہال[4]، تشنگی[5] ہر ایک کیفیت اشتداد[6] پر تھی۔ منھ اندھیرے آدمی حکیم کے پاس دوڑ گیا

---

[1] خرابی [2] ہاتھ پاؤں کا ٹھنڈا پڑ جانا [3] اینٹھن۔ تھرتھراہٹ [4] دست [5] پیاس [6] زیادتی۔

حکیم جی خود خفقانی المزاج، ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے مگر ہمسائگی مدت کی راہ و رسم طوعاً و کرہاً آئے اور کھڑے کھڑے چھڑا سا اُتار کر چلے گئے۔ بیمار میں تو بولنے اور بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ ایک پہر ہی بھر کی بیماری میں چارپائی سے لگ گیا تھا۔ عورتوں نے پردے میں سے جہاں تک اس گھبراہٹ میں زبان نے یاری دی کہا لیکن حکیم صاحب یہی کہے چلے گئے کہ برف کے پانی میں نارجیل دریائی گھس گھس کر پلائے جاؤ۔ا

تیمارداروں کو ایسی سرسری تشخیص اور ایسی رواروی کی تجویز سے کیا خاک تسلی ہوتی فوراً آدمی کو شفاخانے دَوڑایا اور ڈاکٹر دَوالے صدا کی طرح آموجود ہوا اوپر تلے چار پڑیاں تو اُس نے اپنے سامنے پلائیں چلتے ہوئے ایک عرق دیتا گیا کہ پاؤ گھنٹے بعد پلا کر مریض کو علیحدہ مکان میں اکیلا لٹا دینا۔ کوئی آدمی اُس کے پاس نہ رہے تاکہ اُس کو نیند آجائے۔ اگر سو گیا تو جاننا کہ بچ گیا۔ فوراً ہم کو خبر دینا، ڈاکٹر کے حکم کے مطابق نصوح کو اکیلے دالان میں سُلا کر لوگ اِدھر اُدھر ٹل گئے مگر دبے پاؤں آ کر دیکھ جاتے تھے۔ نصوح کے دل کی جو کیفیت تھی وہ البتہ عبرت انگیز تھی۔ یہ کچھ تو بیماری کا اشتداد ہوا مگر ہوش و حواس سب بدستور تھے۔ وہ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ غش میں پڑا ہے۔ ابتدا میں تو نصوح بھی اپنی نسبت مرنے کا تصور کرتے

ا خوشی یا ناخوشی کے ساتھ۔

گریز کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تئیں مرنے والا سمجھے بلکہ جو لوگ اُس کی علالت کو سوءِ ہضم اور امتلا کی وجہ سے تجویز کرتے تھے دل میں اُن کی رائے کی تحسین کرتا تھا۔ لیکن افسوس یہ مسرت نصوح کو بہت ہی ذرا سی دیر تک نصیب ہوئی دمبدم اُس کی حالت ایسی ردی ہوتی جاتی تھی کہ زندگی کے تمام تر احتمالات ضعیف سے تھے آخر چار و ناچار اُس کو سمجھنا پڑا کہ اب میں دُنیا میں چند ساعت کا مہمان اور ہوں۔ اذعانِ[1] مرگ کے ساتھ پہلا قلق اُس کو دُنیا کی مفارقت کا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ مرنا وہ سفر ہے کہ جس کا انقطاع[2] نہیں وہ جدائی ہے کہ جس کے بعد وصال نہیں۔ وہ گم شدگی ہے کہ جس کی کبھی بازیافت نہیں۔ وہ غشی ہے جس سے افاقہ نہیں۔ وہ بیگانگی ہے جس کے پیچھے کچھ تعلق نہیں۔ کبھی وہ بیوی بچوں کو دیکھ کر روتا اور کبھی ساز و سامانِ دُنیا پر نظر کر کے سر کو دُھنتا اور کہتا ؎

حیف[3] در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوے گل سیر نہ دیدیم وبہار آخر شد

جس جس پہلو سے غور کرتا تھا اپنا مرنا اُس کو بے وقت معلوم ہوتا تھا بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا کوئی اس کی عمر بیوہ ہونے کی ہے۔ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل[4] ہو،

[1] یقین [2] ختم ہونا [3] افسوس کہ جلدی ہی یار کی صحبت تمام ہو گئی۔ ہم نے ابھی گل کی صورت اچھی طرح نہ دیکھی تھی کہ بہار چلی گئی [4] خرچ کا ذمہ دار

نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل ہے کہ گھر کو سنبھال لے۔ اندوختہ جو ہے سو داجبی ہی واجبی ہے۔ کب تک اکتفا کرے گا۔ دونا کدخدا بیٹیاں اُس کے آگے ہیں۔ کچّا ساتھ۔ خالی ہاتھ۔ بچوں کی پرورش کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں۔ کیا ہو گا؟ اور کیونکر یہ پہاڑ زندگی اس سے کاٹے کٹے گی۔ بڑا لڑکا تو پہلے ہی گویا ہاتھ سے جا چکا ہے۔ رہا منجھلا امسال انٹرنس پاس کرنے کو تھا اور اُمید تھی کہ یہ کچھ ہو گا مگر اب وہ تمام منصوبہ ہی غلط ہوا چاہتا ہے۔ میری آنکھ بند ہوئی تو کیسا پڑھنا اور کس کا امتحان۔ یہ دو لڑکیوں کا فرض، کیسا میں اپنی گردن پر لے چلا۔ بڑی لڑکی کی نسبت کن کن مصیبتوں سے ٹھہری تھی اور جب میرے رہتے یہ دقّت تھی تو اب ان دو بچّیوں کا دیکھئے کیا ہو۔ پیش بینی[1] اور مآل اندیشی کرکے پارسال گانوں لیا تھا ابھی تک پٹّی داروں نے اُس میں اچھی طرح تسلط[2] نہیں بیٹھنے دیا اب جو چالیس پچاس بیگھہ سیر کرکے نیل بو لیا تھا وہ سب گیا گزرا ہوا۔ گو دام پر جو روپیہ لگا دیا تھا وہ بھی ڈوبا۔ رہنے کے مکان میں کس تنگی سے بسر ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آنکلتا ہے تو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شمال رویہ دالان در دالان بنوانے کا ارادہ تھا۔ ڈیڑھ دو ن لکڑی کا روپیہ بھیج چکا ہوں وہ نہیں آئی۔ پزاوے والوں کو اینٹوں کی دادنی[3] دی تھی، وہ نہیں پٹی، افسوس کہ موت نے مجھ کو مہلت نہ دی اگلوں کا لینا دینا حساب کتاب بڑے بڑے بکھیڑے ہیں آج سمجھانے بیٹھوں تو

---

[1] پس انداز [2] قبضہ [3] وہ روپیہ جو ادا کرنا ہو۔

حسینوں میں جا کر سے ہوں تو ہوں۔ اجل سر پر آپہنچی ۔ تمام لبینا رلو انا
مارا پڑا ۔ اے کاش ! میں کچھ نہیں تو دس بارہ برس ہی اور جی جاتا تو
یہ سب انتظام اپنی خواہش کے مطابق درست کر لیتا ۔ بال بچے بھی ذرا اور
سیانے ہو جاتے ۔ کھانے کمانے لگتے ۔ ادھر ان کے شادی بیاہ کر چکتا
گانوں کا معاملہ بھی رو براہ ہو جاتا ۔ مکان کو اپنے طور پر بنا لیتا لوگوں کا
حساب کتاب سب صاف کر دیتا ۔ گھر والی کے واسطے کچھ ذخیرۂ وافی فراہم
کر جاتا تب فراغت سے مرتا ۔ کیا مرنے میں مجھ کو کچھ عذر یا خدانخواستہ
کسی طرح کا انکار تھا ۔ یا میں اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھتا کہ دُنیا میں
آکر مرنا ضرور ہے مگر ہر چیز ایک وقتِ مناسب پر ٹھیک ہوتی ہے یہ بھی
کوئی مرنا ہے کہ ہر ایک کام کو ادھورا ۔ ہر ایک انتظام کو ناقص و ناتمام
چھوڑ کر چلا جاؤں ۔ ایسا بے ہنگام مرنا نہ صرف میرے لئے بلکہ
میرے تمام متعلقین اور وابستگان[لہ] کے لئے موجبِ زیاں و باعثِ
نقصان ہے ۔

اگرچہ نصوح بنظرِ ظاہر ایک آزاد اور بیگانہ وار زندگی بسر کرتا تھا ،
نہ تو ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی اُس کی خو تھی ، نہ بال بچوں ہی سے
کچھ بہت اختلاط کرنے کی عادت ، انتظام خانہ داری میں بھی بی بی کے
تقاضے اور اصرار سے بقدرِ ضرورت کچھ دخل دیا تو دیا ورنہ اُس کی
بھی چنداں پروا نہ تھی ۔ اور یہی سبب تھا کہ جب کبھی سننے کا اتفاق ہوتا

لہ خاندان والے عزیز و اقارب ۔

کہ فلاں شخص نے بڑی حسرت کے ساتھ جان دی تو نصوح کو تعجب ہوتا اور کہتا کہ خدا کی شان ہے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ دُنیا سے نکلنے کو اُن کا جی ہی نہیں چاہتا۔ نہیں معلوم دُنیا کی کون سی ادا اُن کو پسند ہوتی ہے۔ ورنہ استغفر اللہ یہ دارالمحن[1] انسان کے رہنے کے لائق ہے؟ صدہا بکھیڑے، ہزارہا مخمصے، روز کے جھگڑے، آئے دن کی مصیبت، سچ ہے خدائے تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں۔ ظاہر میں تو موت سب کو بُری معلوم ہوتی ہے اور اُس سے لوگ ایسا ڈرتے ہیں جیسے مجرم سزا سے لیکن غور کر کے دیکھو تو مرنا بھی ایک نعمت ہے انسان کی طبیعت تازگی پسند واقع ہوئی ہے جہاں ایک حالت سالہا سال رہی، گو وہ حالت کیسی ہی عمدہ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو خواہ مخواہ آدمی اُس سے ملول ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی منّ و سلویٰ کھاتے کھاتے ایسے اُکتائے کہ آخر کو اُن کے دل لہسن اور پیاز پر للچائے اگر دُنیا میں موت نہ ہوتی تو آدمی کنوؤں میں کود کود کر اور درختوں سے گر گر کر جان دیتے اور حیات دراز کو عذاب مقیم سمجھتے میرے دل کی تو یہ کیفیت ہے کہ مجھ کو یہاں سے چلے جانے کی مطلق پروا نہیں اور کسی چیز کو میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو اُس کی مفارقت کا قلق ہو

لیکن بڑا فرق ہے فرض اور واقعات میں۔ یہ بھی نصوح کے نفس کا مکر تھا کہ وہ اپنے تئیں دُنیا سے بے تعلق اور اپنی زندگی کو

[1] رنجوں کا گھر مُراد دنیا۔

بے ہمہ د باہمہ سمجھتا تھا۔ جب تک وہ دوسروں کو مرتا دیکھتا تھا اپنے
تئیں مرنے پر دلیر پاتا تھا لیکن جب خود اپنے سر پر آن بنی تو سب سے
زیادہ بودا نکلا۔ وہ اپنے تعلقات سے واقع میں اب تک بے خبر تھا
جب موت سامنے آموجود ہوئی اور چلنا ٹھہر گیا تو حقیقت کھلی کر ادھر
زن و فرزند کا فریفتہ ہے اُدھر مال و متاع کا دلدادہ۔ اتنا بڑا تو سفر
اس کو درپیش مگر بار علائق[1] کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر اُس کے پاؤں
ہزار ہزار من کے ہو رہے تھے۔ ریل کی سیٹی بج چکی تھی مگر یہ ابھی اسٹیشن
کے باہر اسباب کے سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اگر اسی حالت میں کہ
اس کی روح تعلقات دُنیوی میں ڈانواں ڈول بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھی
کہیں خدا نخواستہ اس کی جان نکل جاتی تو بس دونوں جہاں سے گیا
گزرا ہوا تھا خَسِرَ الدُّنیا وَالاٰخِرَۃَ[2] ازیں سو رانده وزاں سو درمانده
مگر خدا نے بڑا ہی فضل کیا کہ نا اُمیدی نے اُس کی ہمت بندھائی اور
اپنے دل میں سوچا کہ چلنا تو اب ٹلتا نہیں پھر قلق سے فائدہ اور اضطراب
سے حاصل۔ مرتا ہوں تو مردانہ وار کیوں نہ مروں اور استقلال کے ساتھ
جان کیوں نہ دوں اس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ دُنیا کی تمام چیزوں پر
ایک اُداسی چھا گئی اب جس چیز کو دیکھتا ہے ہیچ اور بے وقعت نظر آتی
ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کو دوا پلا کر تنہا لٹوایا تھا۔ استغنا[4] سے
ایک اطمینان جو دل کو پہنچا اور ادھر علالت کے اشتداد کا تکان تھا ہی اور پے

[1] عاشق [2] تعلقات [3] دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان ہوا [4] بے پروا

پہنچی دوا جو بالخاصہ خواب آور تھی اور تیمار داروں کا ہجوم کم ہوا۔ لیٹا تو نیند کی ایک جھپکی سی آگئی۔

آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر ہوئے اس کے پیش نظر تھے سب اُس کے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب متخیلہ[1] نے اُن کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈ مڈ کرکے ایک نئے پیرائے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالی شان عمارت ہے اور چونکہ نصوح خود بھی کبھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اُس کو یہ تصور بندھا کہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب دار ہے کہ باوجودیکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بخود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے مُنہ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورت بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ اتنی بڑی کچہری[2] ہے مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے[3] اس طرح کے کھرے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہلِ معاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں۔ غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی کرکے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پہنچا کر کاربرآری کر سکے۔

---

[1] قوتِ خیال [2] بھیڑ، ہجوم [3] کام کرنے والے۔

اگرچہ حاکم کی ہیبت ادنیٰ اعلیٰ سب پر چھائی ہوئی ہے مگر اس کی رحمدلی، منصف مزاجی، معاملہ فہمی، ہمہ دانی کا بھی ہر شخص معتقد ہے اختیارات اُس کے اس قدر وسیع ہیں کہ نہ اُس کے فیصلے کی اپیل ہے نہ اُس کے حکم کا مرافعہ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف۔ کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصل نہ ہو جائیں پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو سرداردی اور سرسری طور پر تجویز کر کے ٹال دیا جائے۔ نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے ہر عذر کو رفع، ہر حجت کو قطع، خود مجرم کو قائل معقول کر کے اور گنہگار کے منھ سے اُس کی خطا تسلیم کرانے کے بعد غرض جو تجویز ہے موجہ، جو فیصلہ ہے مدلل، جو رائے ہے حتمی واذعانی، جو حکم ہے دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل ثقہ اور راست گو کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال، چشم دید، بلکہ ملزم کے رفیق و ہمنشین کہ اُس کے رازدار اور معین و مددگار ہوں۔

پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو فرداً فرداً فرد قرار دار جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور جتنے الزام اُس پر لگائے گئے ہیں سب کو سمجھتا اور اپنی برأت کے وجوہات کو سوچتا ہے کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علیحدہ جگہ میں

سلہ وجہ ۲ھ بادلیل ۳ھ قطعی ۴ھ منصف ۵ھ قابل اعتبار ۶ھ بری ہونا۔

نظر بند ہے جو جیسا مجرم ہے اُس کے مناسب حالت اُس کو حوالات میں سختی یا سہولت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیل خانہ ہے مگر بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔ محنت کڑی۔ مشقت سخت، جو اُس میں گرفتار ہیں سُولی کے متمنی اور پھانسی کے خواستگار رہیں۔ نصوح یہ مقام ہولناک دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر حوالاتوں اور زیر تجویزوں میں تھا۔ ان لوگوں میں ہزار ہا آدمی تو اجنبی تھے لیکن جا بجا شہر اور محلے کے آدمی بھی نظر آتے تھے مگر وہ جو مر چکے تھے۔

نصوح کو یہ سب سامان دیکھ کر اُسی خواب کی حالت میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے۔ کس کی کچہری ہے۔ یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں اور میرے ہموطنوں نے کیا جُرم کیا ہے کہ ماخوذ ہیں؟ اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں اُن کو یہاں جوابدہی میں دیکھتا ہوں۔ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ کہ دُور سے اُس کو اپنے والد بزرگوار انھیں حوالاتیوں میں بیٹھے ہوئے نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہے مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں واقع میں وہی ہیں۔ دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ یا حضرت ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں آپ یہاں کہاں؟

باپ۔ میں اپنے گناہوں کی جوابدہی میں ماخوذ ہوں یہ مقام جو تم دیکھتے ہو دار الجزا ہے اور خداوند تعالیٰ جل و علیٰ شانہٗ اس محکمے کا

لے گرفتار ۲ے سزا یعنی بدلا پانے کا گھر

حاکم۔

بیٹا۔ یا حضرت! آپ تو بڑے مُتقی پرہیزگار[1] خدا پرست نیکو کار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا الزام؟

باپ۔ گناہ بھی ایک دو نہیں سیکڑوں ہزاروں، دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال کیسی رُسوائی اور فضیحت[2] سے بھرا ہوا ہے اور میں اس کو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی برائت کی پیش کروں گا۔

یہ وہ کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اُس کو دنیا کے خیالات کے مطابق فرد قرارداد جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرا اٹھا۔ شرک اور کُفر اور نافرمانی، ناشکری اور بغاوت اور بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و غیبت، طمع و حسد، مردم آزاری، نفاق و ریا، حُبِّ دنیا۔ کوئی الزام نہ تھا کہ اُس میں نہ ہو چونکہ نصوح کے دماغ میں خیالاتِ دُنیوی گونج رہے تھے، لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیرات ہند کا دفعہ اور ضمن ڈھونڈھنے۔ سو بجائے دفعات تعزیرات ہند کے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔ متعجب ہو کر باپ سے پوچھا کہ یا حضرت! پھر کیا آپ تمام ان جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں۔

باپ۔ سب کا۔

---

[1] پرہیزگار [2] رسوائی۔ فضیحتا۔

بیٹا۔ کیا آپ حضورِ حاکم اقرار کر چکے ہیں؟

باپ۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں، میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر[1] ہے کہ اگر میں انکار بھی کروں تو پذیرا[2] نہیں ہو سکتا۔

بیٹا۔ جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں؟

باپ۔ اول تو وہ دو شخص کرامً کاتبین[3] اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل اُن سے مخفی نہیں۔ جتنی باتیں کہتے ہیں پتے کی۔ اور کہتے کیا ہیں میرا روزنامچہ عمری لکھتے گئے ہیں اب جو میں اُس کو دیکھتا ہوں حرف بحرف صحیح اور درست پاتا ہوں دوسرے یہی میرے اعضا ہاتھ، پاؤں آنکھ۔ کان۔ کوئی میرے کہنے کا نہیں۔ سب کے سب مجھ سے منحرف[4] سب کے سب مجھ سے برگشتہ، میری مخالفت پر آمادہ، میری تذلیل پر کمربستہ ہو رہے ہیں۔

بیٹا۔ آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں؟

باپ۔ میں اُن کو غلطی سے اعوان[6] و انصار بھیدی اور رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے انھوں نے وہ وہ سلوک میرے ساتھ کئے کہ تسمہ لگا نہیں رکھا۔

بیٹا۔ آپ کا حال کیا ہے؟

باپ۔ جب سے دُنیا کو چھوڑا قبر کی حوالات میں ہوں، تنہائی سے

---

[1] زیادہ [2] منظور [3] وہ دو فرشتے جو آدمی کے کندھوں پر ہیں اور تمام بُرے بھلے عمل لکھتے رہتے ہیں [4] خلاف [5] ذلیل کرنا [6] مددگار۔

جی گھبراتا ہے انجام کار معلوم نہیں۔ شبانہ روز اسی اندیشہ میں پڑا
گھلتا ہوں۔ حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا
مگر صبح و شام ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا
ہے۔ دوزخ وہی ہے وہاں کی تکلیفات دیکھ کر اور سُن کر ہوش اُڑے
جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی
حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا۔

بیٹا۔ پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا۔

باپ۔ خدا نہ کرے کہ پیش ہو جو دن حوالات میں گزرتا ہے غنیمت
ہے۔ اوّل اوّل جب میں حوالات میں آیا تو اعمالنامہ مجھ کو حوالہ کر دیا گیا۔
پس اُسی کو دیکھا کرتا ہوں اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں، نجات کی
کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

بیٹا۔ بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام
آسکتے ہیں۔

باپ۔ اگر میرے لئے عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرو تو کیا
عجب ہے کہ مفید ہو۔ ابھی میرے ہمسایہ میں ایک شخص کی رہائی ہوئی
اُس پر بھی بہت سے الزام تھے مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجے کا
انصاف ہے رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے۔ اُس شخص کے پسماندوں نے
اُس کے واسطے بہت زار نالی کی تو پرسوں یا اترسوں اُس کو بُلا کر
ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب تجھ پر مخفی نہیں رہے

مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے ہی زن و فرزند ہیں ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دینداری کا بیج بویا۔ ہم نے تیری خطا معاف کی۔

سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دعائے خیر کی ہے؟

بیٹا۔ جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شدومد کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے آپ کی عنایتیں آپ کی شفقتیں جب تک جئیں گے یاد کریں گے۔ رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ شاید میرے منھ پر خوشامد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا، دعا کے بارے میں غلط بات کیونکر عرض کروں اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو صوم و صلوٰۃ[1] کے بڑے پابند تھے کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے۔

باپ۔ کیوں نہیں۔ یہ اُنھیں اعمال کی بدولت ہے کہ تم مجھ کو اس حالت میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے مگر یہاں اعمال میں خلوص نیت

[1] روزہ نماز۔

شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی کھوٹے روپے۔ نمازیں بے حضورِ[1] قلب اکارت گئیں اور روزے چونکہ پابندیِ رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا خالی فاقے کے شمار میں در آئے۔

بیٹا۔ پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں؟

باپ۔ استغفر اللہ کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں۔ نفسی نفسی پڑی ہے ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے دوسرے کی نجات تو کوئی کیا کرائے گا پہلے آپ تو سُرخرو ہو لے۔

بیٹا۔ کیوں جناب! معاذ اللہ یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا ہے۔ ہم لوگ تو خیر۔ سارا شہر آپ کے اتقا[2] کا معتقد تھا کیا آپ خدا کے قائل نہ تھے

باپ۔ قائل تو تھا مگر دل سے معتقد نہ تھا۔

بیٹا۔ جناب آپ کے تمام اعمال ظاہر سے مستنبط[3] ہوتا تھا کہ آپ کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ عقیدت ہے۔

باپ۔ وہ تمام عقیدت معلوم ہوا کہ اوپری دل سے تھی۔ جب اوّل اوّل میرا اظہار لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا تھا کہ تیرا رب کون ہے؟ چونکہ مرتے وقت مجھ کو ایمان کی تلقین کی گئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ اللہ[4] وحدہٗ لاشریک لہٗ تب اُس پر جرح کیا گیا کہ بھلا جب

[1] دل کا حاضر ہونا [2] پرہیزگاری [3] معلوم [4] اللہ تعالیٰ اکیلا جس کا کوئی ساجھی نہیں۔

تو دکھن کی نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین رہا اور جو کچھ تو نوکری پر سے کما کر لایا سب صرف ہو گیا اور تو نانِ شبینہ کو محتاج ہو کر نوکری کی جستجو میں اِدھر اُدھر پھرتا تھا اور مضطر ہو ہو کر ہم سے دعائیں مانگتا تھا مگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لئے تیرے مدعا کو حیزِ التوا میں ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکمِ ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا ہمارے ایما سے تیری پرورش کا وعدہ کیا مگر ہم نے تجھ پر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا۔ سچ بتا کہ تجھ کو اُس انگریز کے وعدۂ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہماری تحریری[1] تمسک وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا[2] کا اگر تو ہم کو صمیمِ قلب سے حاضر و ناظر۔ سمیع[3] و بصیر[4] و قادر[5] جانتا تھا تو گناہ پر تجھ کو کیونکر جسارت[6] ہوتی تھی۔ تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا۔ کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا مگر تو گناہوں کا نہایت بیباکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتشِ دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو تو اُس کو دُنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دُنیا میں جو کچھ رفاہ[7] جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق، صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا۔ تو نے اس کو ہمیشہ اپنی حسنِ تدبیر کی طرف منسوب

---

[1] قرآن شریف [2] زمین پر جس قدر جاندار ہیں سب کی روزی کا ذمہ دار اللہ ہے [3] دیکھنے والا
[4] سننے والا [5] دیکھنے والا [6] قدرت والا [7] دلیری [8] فائدہ۔ نفع۔ بھلائی۔

نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارا کرتا تھا مگر کیا تو اُس کا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات[1] پر نہیں لگاتا تھا؟

اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھ پر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہوسکا کہ بھلا مُنھ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر! بے شمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا۔ جتنی میں تیری رعایت کرتا رہا اُسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا اس حیاتِ بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اسی چندروزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرۂ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے تجھ کو نیست سے ہست کیا اور خلعت انسانیت سے تجھ کو سرفراز فرمایا۔ جو تجھ کو درکار تھا سو دیا جس کا تو حاجتمند تھا سب مہیا کیا۔ ہر حال میں تیرے حافظ۔ ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے کیا اسی واسطے کہ تو کبھی بھول کر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے۔ اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہم سے جُدا رکھے؟

جب تو ایک مضغۂ گوشت[2] تھا ضعیف ولایعقل۔ نادان و جاہل ضعیف اتنا کہ نقل و حرکت پر قادر نہیں۔ نادان ایسا کہ خویش و بیگانے کا امتیاز نہیں ہم نے تجھ کو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے

---

[1] صفتوں کا مجموعہ [2] گوشت کا ٹکڑا۔

جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کئے اور اُن کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ انھوں نے ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا اور تو روز بروز چونچال اور خوشحال ہوتا گیا پھر ہم نے عقل کو تیرا اصلاح کار بنایا کہ تو اس کی مدد سے اپنی آسائش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچا لے۔ دُنیا کے چرند پرند حیوانات نباتات[۱] ۔ جمادات[۲] سب کو تیرا مطیع فرمان بنا دیا کہ تو اُن پر حکمرانی کرے اور اُن پر متصرف رہے گیا اس لئے کہ تو بہک کر کبھی کبھی ہماری طرف رُخ نہ کرے اور سدا تو ہم سے بھاگا بھاگا پھرے تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود تھی دو لمحے تجھ کو تنفس کے لئے ہَوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا ایک رات دن بے آب و دانہ تجھ کو جینا دشوار ہوتا ۔ منوں ہَوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے ۔ غلّہ انبار کے انبار ٹھونس گیا اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت ، زندگی بھر کنویں تو نے خالی کئے ہوں گے مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں اور ایک پانی اور ہوا اور غلّہ و غذا کیا ، ضرورت کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا ۔ ہمارے توشہ خانۂ عام سے ، مگر اس پر تیری یہ ہیکڑی[۳] تھی کہ گویا ہم تیرے قرضدار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا اُدھار آتا ہے تو کھاتا تھا اور ہنکرتا تھا ، لیتا تھا اور بھول بھول جاتا تھا ۔ دُنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ تجاہل کرتا تھا ۔

---

[۱] گھاسیں ، درخت وغیرہ [۲] پتھر و جواہر وغیرہ [۳] اکڑ فوں ۔

منھ پر آنکھیں تھیں اور اندھا، ایک چھوڑ دو دو کان تھے اور بہرا۔ زمین آسمان چاند سورج ستارے جنگل دریا میدان انواع واقسام کے درخت، پھل پھول کھانے کو الوان نعمت پہننے کو رنگارنگ خلعت جواہر بیش بہا نقرہ وطلا، دنیا بھر کا سامان ہم نے تیرے واسطے مہیّا کیا اور ایک تیرے دم کے لئے اس قدر لوازمہ بہم پہنچایا ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف۔ ہم کو اس قدر تیری بزرگ داشت ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ۔ ہم چاہتے تو ایک ادنیٰ سی چیونٹی تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی۔ ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادّہ ایسا تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کر دینے کو بہت تھا مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے اور تو ہم سے عداوت۔ ہم عنایت کرتے تھے اور تو بغاوت۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے ہم کو دیا کیا یہی تھا صلہ جو تجھ سے ہم کو ملا۔ ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ روح یہ ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے۔ یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی[1] اور حفاظت کما حقہ کیجیو جیسی اُجلی شفاف بُراق روشن یہاں سے لئے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اے روسیاہ اس کو لایا ہے مگر پتھر سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر نجس ناپاک تیرہ، بے آب، بدرونق، خراب، ہم نے تو تجھ سے چلتے چلتے

---

[1] جیسا چاہیئے۔

کہہ دیا تھا کہ تو دُنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو جیسے سرائے میں مُسافر، تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آکر جاگا۔ تھا تو مُسافر اور بن بیٹھا مُقیم۔ تھا تو سیّاح[1] اور ہو گیا متوطن، کیا تو تمام عمر دنیا میں مال جمع نہیں کرتا رہا اور کیا تو نے پکّی پکّی عمارتیں اس خیال سے نہیں بنوائیں کہ مدتوں اُن میں رہے گا مُسافر کا یہی کام ہے؟ سیّاح کا یہی شیوہ ہے۔ تو تو جانتا تھا کہ تجھ کو یہاں لَوٹ کر آنا ہے پھر مرنے کے نام سے تجھ کو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سُن کر تو مچلتا کیوں تھا؟

اوّل تو تجھ کو ہماری عبادت کا اتفاق ہی نہیں ہوا لیکن جب کبھی تو لوگوں کے شرم حضور یا دکھاوے یا اتباع رسم کی وجہ سے مصروف عبادت ہوا بھی تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں۔ کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو سے خالی تھی؟ دنیا کی برسوں کی بھولی بسری باتیں تجھ کو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا۔ نہ تعدیل ارکان[2] ٹھیک، نہ قومہ[3] درست، نہ قعدہ[4] صحیح برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا۔ برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے تجھ کو حکم دیا تھا تاکہ تجھ کو ہماری نعمتوں کی قدر ہو۔ تجھ کو اپنے ابنائے جنس پر جو مبتلائے مصیبت ہیں رحم آئے اور تیری صحتِ بدنی کو بھی نفع پہنچے۔ تیرے مزاج میں

[1] سیر کرنے والا [2] نماز کے ارکان کو درست ادا کرنا [3] قیام [4] بیٹھنا۔

فروتنی اور انکسار کی صفتِ محمود کہ یہ ادا ہم کو بہت بھاتی ہے پیدا ہو
لیکن یوں دُنیا کے کام دھندے میں تو تو دن بھر بے آب و دانہ
مصروف رہا نہ شکوہ نہ گِلا۔ تازہ دَم ہشّاش بشّاش پھر کھانا ٹھورنے کو
موجود مگر روزہ چونکہ ہمارے حُکم سے تھا دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس
کی شکایت اور جو آیا اُس سے ضعف و ناتوانی کی حکایت۔ العطش[1]
اور الجوع[2] یہی تیرے دو وظیفے تھے۔ روزہ افطار کیا اور تو بدحواس
ہو کر چارپائی پر ایسا گرا کہ گویا جان نہیں باوجودیکہ دُو دُو دن کا کھانا
ایک رات میں کھا لیتا تھا۔ پھر بھی اس تصوّر سے کہ کل پھر روزہ رکھنا
ہے۔ تیری جوع[3] البقر کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی تو عید کا اسطرح
منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی تاریخ رہائی کا، تیرا بس چلتا تو ۲۹ کیا
۱۹ کی عید کرتا۔ کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو اُمیدوار اور اجر کا
تو متوقع ہے؟

میں نے تجھ کو انسان بنا کر بھیجا تھا تاکہ مصیبت زدوں کی ہمدردی
کرے مگر تو نے ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت کا پہنچانا تو درکنار
دوسروں کو تکلیف دے کر بھی اپنی آسائش حاصل کرنے میں تجھ کو
باک نہ تھا۔ تیرے ہمسائے ہمارے بندے رات کو فاقے سے سوتے
تھے اور تجھ کو سوء ہضم کے علاج سے ان کی پرداخت کی پروا نہ تھی
تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ

[1] ہائے پیاس [2] ہائے بھوک۔ [3] ڈھوروں کی سی بھوک کہ کھانے سے سیر نہ ہونا۔

تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری توشکوں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا۔ نعمتِ مال و دولت جو ہم نے تجھ کو عطا کی تھی تو نے تکلفات لایعنی اور نمود[1] و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف کی اور جو لوگ اُس کے سخت حاجتمند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے تیری سب خباثتیں مجھ کو معلوم ہیں۔ تو نے درماندگی[2] کا نام خُدا رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھ کو کاربرآری کی اُمید ہوتی تھی تجھ کو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظام دُنیا میں اُس کو بھی کچھ دخل ہے۔ مگر جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا تب تو خدا کو یاد کرتا تھا۔ اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی تو تو نے اُس کے اُٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام کی بے توقیری کی اور تو نے اپنا بُرا نمونہ دکھا کر میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا۔

ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سُنتا تھا کیا تجھ کو نہیں سمجھنا چاہیئے تھا کہ ایک دن تو بھی مرے گا۔ خود تیری حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے لڑکے سے جوان ہوا، جوان سے بڈّھا، ناتوان، بال تیرے سفید ہوئے۔ دانت تیرے ٹوٹے۔ کمر تیری جُھکی۔ قوتوں میں تیری فتور آیا۔ غرض ہم نے تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا بہتیرے ٹھنڈے پانی

---

[1] دکھاوا [2] بے بسی یعنی بے چارگی میں خدا کو یاد کرنا۔

کے چھینٹے دیے ۔ کئی بار اٹھا اٹھا کر بٹھا بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے کروٹ تک نہ لی ؎

تمامی عمر تو غفلت میں سویا
ہمارا کیا گیا کچھ اپنا کھویا

سخت گیری خود ہماری عادت نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر اپنے بندوں پر جن کا مارنا اور جلانا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے، نہ خر[1] نا مشخص کہ ہم تو دیں نور اور وہ کہے کہ میری آنکھیں پھوٹیں، ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرت پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً[2] بھلا بھلا دیا ہے لیکن توبہ واستغفار[3] ندامت و حسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے ۔ ہماری رحمت حیلہ جو، ہماری رافت[4] بہانہ طلب[5] کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اُس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبت عبودیت[5] صحیح رکھتا تو ہم اُس کی لاکھ برائیوں پر خاک ڈالتے، ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہے کہ اُس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا ۔ عالم اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہو گیا ۔ پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے ۔ کھانے کو ہم نے نہیں روکا ۔ سونے کو ہم نے منع نہیں کیا ۔ تمتعات[6] دُنیوی سے

---

[1] نامعقول گدھا [2] تمامتر ۔ بالکل [3] پناہ چاہنا [4] بڑی شفقت [5] بندگی [6] فائدے ۔

باز نہیں رکھا۔ پھر جو تو نے اُن کی بجاآوری نہ کی تو سوائے تیری بدنفسی کے اور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص نجات جس کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ خواہاں ہے۔ اے کاش! زندگی میں تجھ کو اس کی اتنی بھی پرواہ ہوتی جیسے اُردو پر سفیدی۔ دُنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیان تجھ کو مضطر اور بے چین کر دیا کرتے تھے اگرچہ کیا دُنیا اور کیا دُنیا کا خسارہ۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا۔ لیکن تباہی دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی۔ اے کاش! تجھ کو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا کہ ایک مٹی کے پرانے آبخورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تجھ کو بہت ہی بڑی ندامت ہے لیکن اس ندامت کا کچھ ماحصل نہیں اس واسطے کہ یہ دارالجزا ہے۔ دارالعمل نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھ کو مہلت دیتے ہیں جا اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطیکہ معقول اور قابل قبول ہو۔

فصل دوم

خواب سے بیدار ہو کر نصوح کو اپنی اور اپنے خاندان کی لایعنی زندگی پر سخت تاسف ہوا اور اُس نے تلافی مافات کا عہد کر کے فہمیدہ اپنی بی بی سے ماجرائے خواب بیان کیا اور اصلاح خاندان کے لئے اُس کو اپنا مددگار بنایا

باپ نے جو یہ اپنی رام کہانی سُنائی بیٹے پر اس طرح کی ہیبت چھائی کہ چونک پڑا۔ جاگا تو پھر وہی دالان تھا اور وہی تیمار داریوں کا سامان۔ بی بی پاس بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی۔ میاں کی آنکھ کھُلی ہوئی دیکھ اُس کی جان میں بھی جان آئی، ورنہ جس گھڑی سے میاں نے جی بُرا کیا تھا سہموں کے مارے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا

نصوح آٹھ بجے ڈاکٹر کی دوا پی کر جو پڑا تھا تو اُس وقت کا سُویا سُویا اب کہیں دو بجے جاکر ہوشیار ہوا چونکہ ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نیند اگر آگئی تو جاننا کہ بیمار بچ گیا۔ اُس کے سو جانے سے سب کو تسلّی سی ہو گئی تھی۔

مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو عورتیں پھر گھبرانے لگیں کہ نہیں معلوم کمبخت ڈاکٹر کیسی دوا پلا گیا ہے کہ دوپہر پڑے پڑے گزر گئے کروٹ تک نہیں بدلی، خدا جانے اندر سے جی کیسا ہے اور دل پر ایسی کیا آن بنی ہے، کیونکر ہوش آئے گا، دیکھئے کیا ہونا ہے۔ نصوح بیدار ہوا تو بی بی نے پوچھا کیسی طبیعت ہے؟ اچھے سوئے کہ گھر میں رونا پیٹنا ہو گیا اور تم کو خبر نہیں؟ بولو بات کرو۔ کہ اوپر والوں کو تسلّی ہو۔ کسی بچے کے مُنھ میں دانہ تک گیا ہو تو حرام۔ چھوٹے بڑے سب کل کے کھائے ہوئے ہیں۔ روتے روتے لڑکیوں کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ لڑکے ہیں کہ مضطر اور پریشان پھرتے ہیں۔ بی بی نے ہر چند دلجوئی کی باتیں کیں مگر نصوح کو خواب کا سارا ماجرا پیش نظر تھا مطلق جواب نہ دیا بی بی سمجھی کہ بیماری کی وجہ سے بولنے کو جی نہ چاہتا ہو گا مگر وہ خدشہ[1] سب کے دل سے دفع ہو گیا مبارک سلامت ہونے لگی اور گھر بھر نے بے رمضان کی عید منائی۔ گو دیر ہو گئی تھی مگر لوگ بھوکے تھے بازار سے حلوا پوری منگوا کر سب نے تھوڑا بہت، کھایا پیا۔ کھانے ہی میں کسی نے یہ بات بھی چھیڑی کہ مریض کا غسل صحت ہو تو ایک رتجگا بڑی دھوم سے

[1] اندیشہ۔ ڈبکا۔ خوف۔

کیا جائے اور اچھے ہونے کی شادی کریں یہ لوگ تو شادی اور رتجگے
کے ارادے کر رہے تھے اور نصوح اپنے خواب کے تصوّر میں غلطاں
پیچاں تھا۔ اُس کا دل مان گیا تھا کہ یہ خواب میرے وہم وخیال کا
بنایا ہوا تو ہرگز نہیں ہے ہو نہ ہو یہ ایک امرِ منجانب اللہ[1] ہے خواب
کیا ہے رویائے صادقہ[2] اور الہامِ الٰہی[3] ہے، باپ کا اظہار اُس نے
ایسی توجہ سے سُنا تھا کہ حرف بحرف نوکِ زبان یاد تھا۔ جتنے الزام
باپ پر لگائے گئے تھے۔ غور کرتا تھا تو سب اپنے میں پاتا تھا بلکہ باپ
کی حالت سے اپنی حالت کو مقابلہ کرتا تھا تو کچھ نسبت نہ تھی اُن
مرحوم کا یہ حال تھا کہ نماز روزے کے پابند وردووظائف کے مُقیّد،
معاملے کے صاف بیوہار کے کھرے لوگوں کے دیکھنے میں محتاط، پرہیزگار،
مُتّقی، دیندار اور یہاں نماز بھی تھی تو گنڈے دار، عیدین تو ضرور
اس واسطے کہ عید سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی تیوہار نہیں اس سے
بھاری کوئی میلہ نہیں۔ برس روز میں یہی دو دن تو سازوسامان کی نمائش
کے ہوتے ہیں۔ کوئی اپنے نئے شاندار کپڑوں میں اکڑ رہا ہے۔ کوئی
گھوڑے کو چھیڑ چھیڑ کر کُداتا ہوا قصداً لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا
چلا جا رہا ہے۔ کوئی نوکروں کی ہٹو بڑھو سُن کر پھولا ہوا ہے۔ کوئی کرائے
یا مانگے کے تانگے پر سوار گاڑی بان سے کہتا ہے۔ چودھری کیسا
سٹریل تانگا بنا رکھا ہے۔ گدّا ہے تو میلا پوشش ہے تو پھٹی ہوئی۔

[1] اللہ کی طرف سے [2] سچے خواب [3] خُدا کا اشارہ۔

نہ بیلوں کے گلے میں گھونگرو، نہ پہیوں میں جھانجھ[1]۔ خیر، اب نماز کا وقت قریب ہے، اتنا تو کر کہ وہ آگے جو یکّہ جا رہا ہے، اس کے برابر لگائے چل۔ مرد آدمی تجھ کو انعام لینے کا بھی سلیقہ نہیں۔

رہا جمعہ اگر کپڑے خوب صاف ہوئے اور دھوپ بھی ایسی سخت نہ ہوئی دن ابر و باد سے پاک ہوا دوست آشناؤں سے ملنے کو جی چاہا تو گئے ورنہ محلّے ہی کی مسجد میں ٹرخا لی[2] یا دل میں تاویل کر لی کہ شرائط جمعہ میں اختلاف ہے۔ پنج وقتی کو تو کبھی فرض و واجب کیا، مستحب بھی نہیں سمجھا۔ صبح اور ظہر اور عشا تو عمر بھر پڑھی ہی نہیں کیونکہ عین سونے کے وقت تھے۔ رہی عصر سو ہوا خوری اور سیر بازار خرید و فروخت، دوست آشناؤں کی ملاقات دنیا بھر کی ضرورتوں کو بالائے طاق رکھتے تو ایک نماز پڑھتے۔ مغرب کے واسطے تو عذر ظاہر تھا وقت کی تنگی جب تک پھر پھرا کر گھر آئے حُمرت[3] شفق زائل ہو جاتی تھی۔ یہ تو اُس عبادت کا حال تھا جس کو ثواب بے زحمت اور اجرِ بے تکان کہنا چاہیئے اور جس عبادت میں ذرا سی تکلیف بھی تھی جیسے روزہ یا زکوٰۃ حتی الوسع کوئی نہ کوئی حیلۂ شرعی اُس سے معاف رہنے کا سوچ لیا جاتا تھا۔

رجب کا مہینہ آیا اور روزوں کے ڈر کے مارے، ایک عجب طرح کا سہم چڑھا۔ سب سے آسان نسخہ یہ کہ کسی طبیب کے یہاں آنا جانا شروع کیا، اُنھوں نے چند روزہ زندگی کے واسطے وہ وہ بکھیڑے

---

[1] ایک قسم کا باجہ [2] بیدلی سے نماز ادا کی [3] سُرخی

کھڑے کر رکھے ہیں کہ روئے زمین پر اُن کے نزدیک کوئی تندرست ہی نہیں۔ یوں ملنے ملاقات کرنے جاؤ تو پان کے عوض نسخہ حوالے کر دیتے ہیں اور جہاں ایک دفعہ دوا پی اور روگ لگا۔ رمضان کے آتے آتے طبیعت خاصی محتاجِ مسہل ہو گئی اور حکیم صاحب کی بدولت روزوں سے بچ گئے۔

زکوٰۃ کا ٹال دینا تو کچھ بڑی بات نہ تھی۔ نصاب[1] پر حول[2] کامل کیوں گزرنے دیں کہ زکوٰۃ دینی پڑے۔ جب دیکھا کہ برس پورا ہونے آیا، بی بی کے نام زبانی ہبہ کر دیا۔ گھی کہاں گیا کھچڑی میں، جب بی بی پر جو زکوٰۃ کا وقت آیا پھر اپنے نام ہبہ کرا لیا اور ٹھٹھیرا بدلائی کر کے حکمِ خدا کو بالا بتایا۔ مال کو ایسے پیرایے میں رکھا کہ زکوٰۃ سے بری رہے۔ خاصی طرح دُکانیں مول لیں۔ مکان بنوائے اُن میں کرایہ دار بسائے کہ "مال نامی[3] آپ نامی زکوٰۃ ندارد"۔

غرض جہاں تک نصوح احتساب کرتا تھا اپنے تئیں دین سے بے بہرہ، ایمان سے بے نصیب۔ نجات سے دُور۔ ہلاکت و تباہی سے قریب پاتا تھا جس عمل نیک پر نظر کرتا یا تو سرے سے اُس کے اعمالنامے میں تھا ہی نہیں اور تھا بھی تو ایک عمل اور سیکڑوں رخنے،

---

[1] اتنا مال جس پر زکوٰۃ دینا واجب ہو [2] سال [3] نامی کے دو معنی ہیں۔ اوّل متعارف یعنی نامیدہ و مشہور اور دوسرے اسم فاعل نمو سے یعنی بالندہ و روز افزوں۔ مال نامی میں دوسرے معنی مُراد ہیں اور آپ نامی میں اوّل۔

ہزاروں فساد۔ دو چار نمازیں ہیں تو کاہلی اور بیدلی وریا سے خالی نہیں۔ کبھی جاڑے کے دنوں میں یا افطار وسحر میں شریک ہو جانے کی نظر سے جو روزے رکھنے کا اتفاق ہوا تھا تو اُن میں دکھاوے اور ظاہر داری کا نقص تو تھا ہی تھا تکلیف کی شکایت سے نیکی برباد گنہ لازم۔ کبھی کسی بھوکے ننگے کو وہ چیز جو اپنے مصرف کی نہ تھی دی تو اس کو یوں اکارت کیا کہ ایک دفعہ دے کر سو سو بار احسان جتایا اور سمجھے کہ بیچارے محتاج کو عمر بھر کے واسطے مول لے لیا۔ خلاصہ یہ کہ یہ کوئی عمل نیک نہ تھا جو خالصۃً للہ ہو اور انصافاً اُس کے ثواب کی توقّع اس کے اجر کی اُمّید کی جائے[1] اِن خیالات نے نصوح کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ بے اختیار ہو کر رویا اور کہنے لگا کہ الٰہی مجھ سے زیادہ نالائق۔ نابکار۔ ناکس ناہنجار بھی کوئی شخص ہو گا کہ میں نے اپنی ساری عمر تیری نافرمانی میں کاٹی۔ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا یا پیدا ہوا تھا تو معصیت[2] پر قدرت نہ رکھتا۔ کوئی ایسی سخت مصیبت مجھ پر پڑتی کہ سر کھجانے کی فرصت نہ دیتی مُجھ پر بجلی نہ گری، آسمان نہ ٹوٹ پڑا۔ مجھ کو سانپ نہ سونگھ گیا۔ ہیضہ کر کرا کے میں بیچیا پھر اُٹھ بیٹھا۔ لعنت ہے مجھ پر اگر اب مدۃ العمر گناہ کے پاس پھٹکوں، تُف ہے میری زندگی پر اگر پھر معصیت پر اقدام کروں۔ یہ عہد اپنے جی میں اُستوار[3] کر کے اُس کو پھر اپنی عمر تلف شدہ کا خیال آگیا اور

[1] بدراہ۔ کج روش [2] گناہ [3] مضبوط

دل میں کہنے لگا کہ میں نے ساری عمر جو اس تباہ حالت میں غارت کی اُس کی تلافی کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں اور بڑی بے انصافی ہے کہ میں جُرم کروں اور سزا نہ پاؤں۔ گناہ کروں اور اُس کا پاداش نہ بھگتوں۔
نصوح کو اپنے گناہوں پر اُس وقت اتنی ندامت تھی کہ مرنے کو وہ اپنی ایک ادنیٰ سی سزا سمجھتا تھا۔ گھر بھر اُس کے جانبر ہونے کی خوشی منا رہا تھا اور اُس کو افسوس تھا کہ میں مر کیوں نہیں گیا علالت کی وجہ سے اٹھنے سے معذور تھا مگر تکیہ پر اوندھا سر کئے ہوئے پڑا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خدایا میں تو اسی قابل ہوں کہ دوزخ میں جھونک دیا جاؤں مگر جو تو نے اپنے فضل سے پھر چند روز کے واسطے مجھ کو دُنیا میں رکھ لیا ہے تو ایسی توفیق عطا کر کہ نکوکاری اور تیری اطاعت و فرماں برداری میں رہوں، اور میری زندگی دیندارانہ زندگی کا نمونہ ہو۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ ہوا تو نصوح کو خاندان کا خیال آیا۔ دیکھا تو بی بی بچّے سب ایک رنگ میں ہیں۔ دُنیا میں مُنہمک[1]، دین سے بیخبر۔ تب یہ دوسرا صدمہ نصوح کے دل پر ہوا کہ واحسرتا! میں تو تباہ ہوا ہی تھا مگر میں نے ان تمام بندگانِ خدا کی بھی باٹ ماری۔ اپنی شامت اعمال کیا کم تھی کہ میں نے ان سب کا وبال سمیٹا۔ مجھ کو خدا نے اس گھر کا مالک اور سردار بنایا تھا اور اتنی روحیں مجھ کو سپرد کی تھیں۔ افسوس میں نے

[1] محو۔ پھنسا ہوا۔

ودیعت[1] ایزدی کو تلف کیا اور امانتِ الٰہی کی نگہداشت میں مجھ سے
اس قدر سخت غفلت ہوئی یہ سب لوگ میرے حکم کے مطیع اور میری مرضی
کے تابع تھے ۔ میں نے اپنا بُرا نمونہ دکھا کر ان سب کو گمراہ کیا ۔ اگر میں
قدغن[2] رکھتا تو یہ کیوں بگڑتے اور یہ بگڑے تو آخر اُن سے جو نسل چلے گی
وہ بھی بگڑے گی ۔ غرض میں دُنیا میں بدی کا بیج بو چلا ۔ جو لوگ خدا کے
اچھے بندے ہوتے ہیں باقیات الصّالحات[3] اور یادگار نیک دُنیا میں
چھوڑ جاتے ہیں ۔ میں ایسا بدبخت ہوا کہ مجھ سے یادگار بھی رہی تو بدی
جب تک میری نسل رہے گی بدی بڑھتی اور پھیلتی جائے گی جب یہ
لوگ خدا کے روبرو جواب دہی کے واسطے حاضر ہوں گے تو آخر
کہیں گے کہ ہم کو کسی نے راہِ نیک بتائی ہی نہیں ۔ تو میں کیا جواب
دوں گا؟

یہ خیال کر کے نصوح پھر ایک مرتبہ پکار کر رویا اور دوسرا عہد
اُس نے یہ کیا کہ جتنے لوگ میرے خاندان میں ہیں سب کی اصلاح و ضع
کروں گا اور پھر اُس نے خدا سے دعا کی کہ اے الٰہ العالمین! تو اس
ارادے میں میری مدد کر جو مشکل پیش آئے آسان ہو جائے میری بات
میں اثر دے اور میرے عزم میں استحکام ۔

نصوح کو ایسی ٹھوکر نہیں لگی تھی کہ وہ اُس کو بھول جاتا ۔ تنبہ[4]
ہوئے پیچھے اُس کو اپنی اصلاح دشوار نہ تھی ۔ مگر اصلاحِ خاندان ایک

[1] سونپی ہوئی امانت [2] تاکید ۔ تنبیہ [3] نیک لوگوں کی چھوڑی ہوئی نشانیاں [4] خبرداری

بڑا مشکل کام تھا وہ بخوبی واقف تھا کہ دینداری اور خدا پرستی میرے خاندان کے لئے بالکل نئے الفاظ ہیں جن سے چھوٹے بڑے کسی کے کان آشنا نہیں وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ گھر بھر ایک طرف ہوگا اور میں اکیلا ایک طرف۔ نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا، اور میں ایک سورما چنا بن کر کیونکر معصیت کے بھاڑ کو توڑ ڈالوں گا، پس وہ غور کرنے لگا کہ کس کو اپنا مددگار بنائے کس کو صلاح کار قرار دے۔ آخر یہی دل میں آیا کہ اصلاح خاندان کے لئے بی بی سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں اور خدا کو کچھ اس خاندان کی فلاح[1] ہی منظور تھی کہ نصوح نے بی بی کو پڑھا لکھا بھی لیا تھا۔

جب نصوح کا نیا نیا بیاہ ہوا انھیں دنوں تعلیم نسواں کا چرچا شروع ہوا تھا۔ نئی نئی کتابیں جو عورتوں کے واسطے جاری ہوئی تھیں نصوح نے سب کو بہت شوق سے دیکھا تھا اور اُس کا دل اس بات کو مان گیا تھا کہ عورتوں کے لکھانے پڑھانے میں چند در چند فوائد دینی و دنیوی مضمر[2] ہیں چنانچہ اس نے بعض کتابوں میں سے بعض مقامات دلچسپ بی بی کو پڑھ کر سنائے۔ بھلائی کی بات سب ہی کو بھلی معلوم ہوتی ہے بی بی نے بھی اس کو تسلیم کیا کہ عورتوں کے لئے پڑھنا بہت مفید ہے بال بچوں کا کچھ بکھیڑا نہ تھا میاں سے پڑھنا شروع کیا تو چار پانچ مہینے میں اُردو لکھنے پڑھنے لگی تب سے اب تک تھوڑا بہت مشغلہ چلا ہی جاتا تھا۔

---

[1] بھلائی۔ سلامتی [2] چھپی ہوئی۔

نصوح کو اُس وقت بی بی کا پڑھا ہونا بہت ہی غنیمت معلوم ہوا اور سمجھا کہ بی بی یوں بھی خدا کے فضل سے اسم با مسمیٰ فہمیدہ ہے اُس کا سمجھا لینا تو چنداں دشوار نہیں۔ رہے بچّے جن کی عمر چھوٹی ہے وہ بھی اصلاح پذیر ہیں۔ بڑی دقت تو بڑی عمر والوں کی ہے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی بیاہے جا چکے تھے سمجھا کہ یہ دونوں اپنے گھر کے ہیں۔ کسی پر میرا اختیار نہیں اور ہو بھی تو جوان بیٹا، جوان بیٹی، ماریں نہیں سکتا۔ گھڑک میں نہیں سکتا۔ نرا سمجھانا اور وہ اس عمر میں، بڑھے طوطوں کا پڑھانا ہے۔ آخر وہ کہیں گے نہیں کہ بُرے ہیں اور بیدین ہیں تو تمھیں نے ہم کو ایسا اٹھایا اور جبکہ ہماری عادتیں راسخ راسخ اور خصلتیں طبیعت ہوگئیں تو اب ہم کو اُن کا ترک کرنا تعلیم کرتے ہو اور ہم کو ناحق مُلزم بناتے ہو، یہ سوچنا تھا کہ نصوح کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور سمجھا کہ ان دو کی اصلاح محال ہے، اُس کو زیادہ تر افسوس اس بات کا تھا کہ خدا کے فضل سے دونوں کے آگے اولاد ہے جس طرح میری بدی نے میری اولاد میں اثر کیا۔ کیا ان کی بدی اُن کی اولاد میں سرائیت[1] نہ کرے گی؟

مگر پھر بھی نصوح نے مصمّم[2] ارادہ کر لیا کہ انشاء اللہ اپنے مقدور بھر تو کوشش کروں گا یا تو راہ راست ہی پر آئیں گے یا جیتے جی چھوڑ دوں گا جو خدا کا نہیں وہ میرا پہلے نہیں۔ منجھلے بیٹے اور منجھلی بیٹی کی طرف سے بھی

[1] اثر ہونا [2] مضبوط۔

نصوح کو خوب اطمینان نہ تھا اور جانتا تھا کہ اُن کے ساتھ بھی دقّت پڑے گی لیکن اُس کا ارادہ ایسا مستحکم تھا کہ کوئی مشکل اُس کو روک نہیں سکتی تھی اور وہ مضطرب اور مستجل اس قدر تھا کہ چاہتا تھا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمالوں، ابھی اچھی طرح بدن میں اُٹھنے بیٹھنے کی طاقت بھی نہیں آئی تھی کہ اُس نے بی بی سے کہا تھوڑا سا پانی گرم کرادو تو میں نہالوں۔

بیوی۔ کیا غضب کرتے ہو، ہاتھ پاؤں میں ذرا دم تو آنے دو نہانے کی ایسی کون سی ساعت ماری جاتی ہے۔ جب اصل خیر سے چلنے پھرنے لگوگے خاصی طرح حمام میں جاکر غسل کرنا۔

میاں۔ میں نماز پڑھنی چاہتا ہوں۔ علالت میں طرح طرح کی بے احتیاطی ہوئی ہے۔ جی قبول نہیں کرتا کہ اسی حالت سے نیت باندھ لوں۔

بیوی۔ کیا اچھے ہونے کی نفل[۱] مانی تھی؟ بی بی نے جو نماز کو سُن کر ایسا تعجّب ظاہر کیا تو نصوح پر گھڑوں[۲] پانی پڑگیا۔ اور جی میں کہنے لگا کہ اللہ اللہ مجھ میں اور نماز میں اتنی دُوری ہے کہ گھر والی بی بی سُن کر تعجّب کرتی ہے ؎

وائے[۳] بر من وائے بر انجام من
عار دارد کفر از اسلام من

---

[۱] نماز جو فرض کے علاوہ ہو [۲] بہت شرمندہ ہوا [۳] افسوس مجھ پر اور میرے انجام پر۔ میرے اسلام سے کفر بھی پرہیز کرتا ہے۔

اور ایک آہِ سرد کھینچکر بی بی سے کہا کہ اگر میں نفلیں پڑھنے والا ہوتا تو بھلے ہی دن نہ ہوتے۔

بیوی۔ منتؔ[1] نہیں، نیازؔ[2] نہیں، تو پھر کیا جلدی ہے۔ نماز کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ اچھی طرح تندرست ہو جاؤ گے تو بہتیری نمازیں پڑھ لینا۔

اب نصوح وہ نصوح نہیں رہا تھا کہ بی بی کو ایسی بے وقعتی کے ساتھ نماز کا تذکرہ کرتے ہوئے سُنتا اور اُس کو ناگوار نہ ہوتا۔ غصہ تو آیا مگر پھر اپنے جی میں سمجھا کہ بی بی کا کچھ قصور نہیں جس کا شوہر بیدین ہو اُس کے ایسے ہی خیالات ہونے چاہئیں۔ تمامتر میری ہی خطا ہے اور ایک میری بیدینی نے سارے گھر کو تباہ کر رکھا ہے بی بی سے اس وقت ردّ و کد کرنا مناسب نہ سمجھ کر اتنا ہی کہا کہ افسوس میری ناکارہ صحبت نے تم کو کس قدر گمراہ کر دیا ہے کہ فرضِ خدا کو تم نے ایک سرسری سا کام سمجھا۔ غرض بی بی کے منع کرتے کرتے نصوح نے غسل کر کپڑے بدل نماز پڑھی۔

(آج نصوح کی یہ پہلی نماز تھی کہ اُس کو داخلِ عبادت کہہ سکتے ہیں وہ اس طرح ہاتھ باندھے ہوئے مؤدّب کھڑا تھا جیسے کسی بادشاہ عالی جاہ کے روبرو کوئی خونی کھڑا ہوتا ہے۔ آنکھیں زمین میں سی ہوئی تھیں۔ ہیبتِ[3] سلطانی اُس پر ایسی چھا رہی تھی، نہ ہلتا تھا نہ جلتا تھا۔ بس،

[1] راہِ خدا میں بول قبول کرنا [2] نذر [3] ڈر۔ خوف

ایک بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ عاجزی اور فروتنی[1] اُس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ حکم کے مطابق کھڑا تھا لیکن جُھک جُھک جاتا تھا اور گر گر پڑتا تھا۔ غرض ایسی ایسی حرکتیں اُس سے سرزد ہوتی تھیں کہ خواہ مخواہ دیکھنے والے کو رحم آئے۔ ہفتے عشرے تک علالت کا کسل[2] رہا۔ پھر تو خدا کے فضل سے نصوح بدستور توانا و تندرست ہو گیا مگر بیماری کے بعد اس کی عادتیں اکثر بدل گئی تھیں۔ ہر وقت تو وہ کچھ سوچ میں رہتا تھا۔ بے ضرورت بکنا، بے تمیزی کے ساتھ ہنسنا لایعنی باتوں میں شریک ہونا، اُس نے مطلقاً چھوڑ دیا تھا لیکن اُس کے ساتھ لینت[3]، تواضع، وسعت، اخلاق، انکسار یہ صفتیں بھی اُس میں آ گئی تھیں۔ بیماری سے پہلے اُس کی بدمزاجی اس درجے کی تھی کہ گھر والے اُس کو ہوّا سمجھتے تھے۔ دروازے کے اندر اُس نے قدم رکھا اور کیا چھوٹے کیا بڑے سب پر ایک سہم چڑھا۔ اگر بھولے سے کوئی چیز بے موقع پڑی رہ گئی اور اُس نے دیکھ پائی سب پر ایک آفت توڑ ماری، کھانے میں اٹکل ہی تو ہے ذرا نمک زیادہ ہو گیا یا مٹھلونا رہ گیا بس اُسی روز جانو کہ گھر میں فاقہ ہوا۔ کتنے تو پیالے شہید ہوئے۔ کتنی رکابیوں کا خون ہوا۔ سارے محلّے میں خبر ہوئی کہ آج کھانا بگڑا۔ بچوں کو بات بات میں جھڑکی، بات بات میں گھڑکی، یا اب نصوح کے سر پر ڈھول بجاؤ

[1] انکساری [2] تکان [3] نرمی۔

کچھ خبر نہیں بلکہ فہمیدہ، بچّوں کو شوخی کرتے دیکھ خفا ہوتی اور کہتی کیسے ناہموار بچّے ہیں، باپ کا تو یہ حال ہے اور یہ انھیں کے کان میں جا کر شور کرتے ہیں، ذرا ڈر نہیں، دیکھو اُٹھی ہی کسر نکلے گی۔

شروع میں نصوح کا یہ انداز دیکھ کر گھر والوں کو بڑا کھٹکا تھا وہ جانتے تھے کہ بیماری سے اُٹھے ہیں، ضرور ہے کہ پہلے سے زیادہ نازک مزاج ہو گئے ہوں گے۔ اس بلا کا غصّہ چڑھا ہے کہ کسی سے بولتے ہی نہیں۔ دیکھئے یہ قہر کس پر ٹوٹتا ہے۔ کس کی شامت آتی ہے۔ مگر نصوح نے ایسا جلاّب نہیں لیا تھا کہ اُس نے خون میں ذراسی گرمی بھی لگی رہنے دی ہو۔ لوگ بیماری سے اُٹھ کر چڑچڑے اور بدمزاج ہو جاتے ہیں اور نصوح حلیم اور بُردبار، نرم دل و خاکسار[۱] ہو کر اُٹھا تھا۔ معاملات روزمرّہ میں اُس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ جو رکھ دیا سو چاؤ سے کھا لیا۔ جو دے دیا سو خوشی سے پہن لیا۔ نہ حجت نہ تکرار۔ نہ غُل نہ غپاڑہ۔

نصوح کی عادت بدلی تو لوگوں کی مدارات بھی اُس کے ساتھ بدل چلی۔ جو پہلے ڈرتے تھے وہ اب اُس کا ادب ملحوظ رکھتے جن کو وحشت و نفرت تھی وہ اب اُس کے ساتھ اُنس و محبت کرتے تھوڑے ہی دنوں میں گھر شور و شغب[۲] سے پاک اور لڑائی جھگڑے سے صاف ہو گیا۔ ابتداءً نصوح کو نماز وغیرہ کا اہتمام کرتے دیکھ کر

---

۱ تواضع ۲ ہاے ہلڑ

گھر والوں نے اچنبھا کیا تھا لیکن پھر تو بے کہے دوسروں پر خود بخود
ایک اثر سا ہونے لگا اور نصوح اسی کا منتظر تھا کہ لوگ اس طرزِ اجنبی
سے کسی قدر مانوس اور خوگر ہولیں تو اپنا انتظام شروع کر دوں نصوح
کی جہاں اور عادتیں بدلی تھیں وہاں ایک یہ بھی تھی کہ وہ خلوت پسند
ہوگیا تھا۔ تمام تمام دن اکیلا بالا خانے پر بیٹھا رہتا۔ بے بلائے اگر
کوئی جاتا تو یہ بھی نہ تھا کہ اُس سے بات چیت نہ کرے مگر حتی الوسع
مجمع سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ بعض کو یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید نیند
بڑھ گئی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا تھا کہ اُترنے چڑھنے کی توانائی نہیں آئی
مگر فہمیدہ کو اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کبھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا
کبھی چُپ بیٹھے ہوئے، آخر ایک روز پوچھا کہ اکیلے چپ چاپ بیٹھے
ہوئے تمھارا جی نہیں گھبراتا؟ تھوڑی دیر نیچے ہی اُتر آیا کرو کہ
بال بچّوں کی باتوں میں دل بہلے۔ مجھ کو گھر کے کام دھندے سے
فرصت نہیں ملتی۔

نصوح۔ میں تم سے اس بات کی شکایت کرنے والا تھا کہ

جب سے میں بیمار ہوکر اُٹھا ہوں۔ ع

تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا کیونکر ہوا؟

کیا تم کو میری عادات میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا؟

فہمیدہ۔ رات دن کا تفاوت[1]، زمین آسمان کا فرق اور پوچھنے کو

---

[1] فرق۔

تمھارے سر کی قسم کئی بار مُنھ تک بات آئی مگر تمھارا ڈھنگ دیکھ کر جرأت نہ ہوئی کہ پوچھوں۔

نصوح ۔ ڈھنگ کیسا؟

فہمیدہ ۔ بُرا ماننے کی بات نہیں ۔ مزاج تمھارا سدا کا تیز ہے یوں ہی ہم سب لوگ تم سے ڈرتے رہتے ہیں ۔ جب سے بیمار ہو کر اٹھے سب کو خوف تھا کہ ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا پہلے ہی سے بلا کا غصہ ہے ، اب بیماری کے بعد کیا ٹھکانا ہے ، ادھر تم کو دیکھا تو کسی کی طرف مُلتفت نہ پایا ۔ سمجھے کہ ضرور طبیعت برہم اور مزاج نادرست ہے ۔ پھر کس کی جرأت ، کس کو اتنی ہمّت کہ پوچھے اور دریافت کرے ۔

نصوح ۔ کیوں صاحب ! کبھی تم نے مجھ کو میرے مزاج کی خرابی پر مُتنبہ نہ کیا ۔

فہمیدہ ۔ تنبیہ کرنا درکنار ، بات کرنے کا تو یارا ہی نہ تھا ۔

نصوح ۔ لیکن ان دنوں تو میں کسی پر ناخوش نہیں ہوا ۔

فہمیدہ ۔ گھر بھر کو اس کو تعجب ہے ۔

نصوح ۔ آخر ، لوگ اس کا سبب کیا قرار دیتے ہیں

فہمیدہ ۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وبا میں کثرت سے لوگوں کو مرتے دیکھا اپنے گھر میں تین موتیں ہوئیں ۔ خود بیمار پڑے اور خدا کے گھر سے پھر کر آئے ، دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے ۔ تمھارے بڑے صاحبزادے

یہ تجویز کرتے ہیں کہ ڈاکٹر نے جو اسہال بند کرنے کی دوا دی، دماغ میں گرمی چڑھ گئی ہے۔ بہرکیف سب کی یہی رائے ہے کہ علاج کرنا چاہیئے۔

نصوح۔ نہ گرمی ہے۔ نہ خلل دماغ ہے۔ خوف البتہ ہے۔

فہمیدہ۔ مرد ہو کر تم اتنے ڈر گئے آخر ہم سب بھی تو اسی آفت میں تھے۔

نصوح۔ تم ہرگز اس آفت میں نہ تھیں۔

فہمیدہ۔ یعنی یہ کہ میں نے ہیضہ نہیں کیا لیکن تمہارا ہیضہ کرنا مجھ کو اپنے مرنے سے زیادہ شاق تھا۔

نصوح۔ نہیں ہیضہ کرنے کی بات نہیں۔ بیماری اگرچہ ظاہر میں سخت تھی مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ شروع سے آخر تک میرے ہوش و حواس سب درست تھے۔ تمہاری ساری باتیں میں سنتا اور سمجھتا تھا۔ ابتدائے علالت میں جو تم لوگوں نے ہیضۂ[1] امتلائی تجویز کیا۔ پھر صبح کو حکیم صاحب تشریف لائے اور میری کیفیت تم نے اُن سے بیان کی، پھر ڈاکٹر آئے اور انھوں نے دوا پلائی۔ مجھ کو سب خبر ہے۔ جب تم لوگوں نے ڈاکٹر کے کہنے سے مجھ کو علیحدہ دالان میں لٹایا تو مجھ کو غنودگی[2] سی آگئی اور میں نے اپنے تئیں دوسرے جہان میں دیکھا۔

---

[1] وہ ہیضہ جو غذا کی زیادتی کی وجہ سے ہو [2] اونگھ

اس کے بعد نصوح نے خواب کا سارا ماجرا حرف بحرف بی بی سے بیان کیا۔ مردوں کی نسبت عورتوں کے دلوں میں نرمی اور رقت زیادہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مذہبی تعلیم عورتوں میں جلد اثر کرتی ہے۔ فہمیدہ نے جو میاں کا خواب سُنا۔ اس قدر خوف اس پر طاری ہوا کہ قریب تھا کہ غش آ جائے۔ نصوح اگرچہ تنہائی میں اپنے گناہوں پر تاسف کر کے ہر روز دو چار مرتبہ رو لیا کرتا تھا اور ظاہر میں نہیں بھی روتا تھا تو اندر سے اُس کا دل ہر وقت روتا رہتا تھا۔ اب بی بی کی ہمدردی و ہمدمی کا سہارا پا کر تو اتنا رویا اتنا رویا کہ گھگھی بندھ گئی۔ فہمیدہ پہلے ہی خوفزدہ ہو رہی تھی میاں کا رونا اُس کے حق میں اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوا۔ اُس نے بھی بلبلا کر رونا شروع کیا۔ پھر تو دونوں میاں بی بی ایسا روئے کہ ساون بھادوں کا سماں بندھ گیا۔ وہ بھی ایک عجیب وقت تھا کہ دو میاں بی بی اپنے اپنے گناہوں کو یاد کر کے رو رہے تھے۔

آخر نصوح نے اپنے تئیں سنبھالا۔ اور بی بی سے کہا کہ دُنیا میں اگر کوئی چیز رونے کے قابل ہے تو میرے نزدیک گناہ اور خُدا کی نافرمانی ہے اور بس کیونکہ کوئی مصیبت کوئی آفت گناہ سے بڑھ کر نہیں۔ دنیا کے نقصانوں پر رونا، بے فائدے دیدے کھونا ہے مگر گناہ پر رونا گویا داغِ الزام کو دھونا ہے۔ رونا کفارۂ[1] معصیت ہے

[1] گناہوں کا بدلہ اور تاوان

رونا گناہگار کے لئے بہترین معذرت ہے۔ رونا رحمت کی دلیل اور مغفرت[1]
کا کفیل ہے لیکن ہم کو اپنی آئندہ زندگی کا انتظام بھی کرنا ضرور ہے۔
ندامت وہی سند ہے کہ افعالِ مابعد میں اُس کا اثر ظاہر ہو۔ توبہ وہی
پکّی ہے کہ آدمی جو دل میں سوچے یا منہ سے کہے ویسا ہی کر دکھائے۔

فہمیدہ۔ لیکن اتنی عمر اس خرابی میں بسر کی اب نجات اور مغفرت
کی کیا اُمید ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ ہمارا مرض علاج سے درگزرا۔

نصوح۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کفر ہے وہ بے نیاز
بڑا غفور رحیم ہے کچھ اُس کو ہماری عبادت کی پروا نہیں۔ اگر روئے زمین
کے تمام آدمی اُس کی نافرمانی کریں تو اُس کی ابدی اور دائمی سلطنت
میں ایک سر مو برابر بھی فرق نہیں آئے گا اور اسی طرح اگر تمام زمانہ
فرشتہ سیرت ہو جائے اور سارے آدمی شبانہ روز مصروفِ عبادت رہیں
تو اُس کی عظمت اور کبریائی میں ایک رائی کے دانے کی قدر بھی
زیادتی اور افزونی نہ ہوگی اگر خدا کو اپنی پرستش اور عبادت ہی کرانی
منظور ہوتی تو وہ نافرمان گنہگار سرکش متمرد[2] انسان کی جگہ فرشتے پیدا
کر سکتا تھا پھر یہ باتیں جو ہم پر فرض و واجب کی گئی ہیں ہماری ہی
اصلاح، ہماری ہی بہبود کے لئے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس میں
پرلے سرے کا رحم اور غایت درجے کا حلم ہے۔ لاکھ گناہ کر دھیاں عجز[3] دلی
کیا۔ منّت و سماجت سے پیش آئے بس پھر کچھ نہیں ہے

---

[1] بخشش [2] نافرمان [3] گڑگڑانا

اگر حشم گیرد بکردار زشت
چو باز آمدی ماجرا در نوشت

وہ معبود جابر[1] نہیں۔ سخت گیر[2] نہیں۔ کینہ ور[3] نہیں۔ مگر ہے کیا کہ غیور[4] بڑا ہے۔ اس کی مطلق برداشت نہیں کہ کسی کو اُس کا شریک خدائی گردانا جائے۔

فہمیدہ۔ کتنا ہی عفو و درگزر کیوں نہ ہو مگر اپنے گناہوں کی بھی کچھ انتہا ہے۔ ماں باپ کو جیسی اولاد کی مامتا ہوتی ہے، ظاہر مگر دیکھو کلیم کی حرکتوں سے میرا تمہارا دونوں کا جی آخر کھٹا ہو ہی گیا۔ کتنی برداشت، کہاں تک چشم پوشی؟

نصوح۔ خدا کی پاکیزہ اور کامل صفتوں کو آدمی کی ناقص و ناتمام عادتوں پر قیاس کرنا بڑی غلطی ہے۔ تمام دُنیا کے ماں باپوں کو جو اولاد کی محبت ہے وہ ایک شمہ ہے۔ اُس عنایت بے غایت اور لطف و شفقتِ بے منت کا جو خداوند کریم ہر حال میں اپنے بندوں پر فرماتا ہے۔ گناہ اور نافرمانی انسان کے خمیر میں ہے اگر بندوں کے گناہ پر اُس کو نظر ہوتی تو ہر متنفس کشتنی اور گردن زدنی تھا۔ دنیا کاہے کو بستی۔ لیکن اللہ رے درگزر[4]، گناہ بھی ہو رہے ہیں اور رزق کا راتب[5] جو سرکار سے بندھا ہے موقوف ہونا کیسا، کبھی ناغہ بھی تو نہیں ہوتا۔ سانس لینے کو ہوا تیار، پینے کو پانی موجود۔ آرام کرنے کو رات، کام

[1] جبر کرنیوالا [2] سختی کرنیوالا [3] غیرت مند [4] معافی [5] مقررہ خوراک۔

کرنے کو دن ۔ رہنے کو مکان ، وہی چاند ، وہی سورج ، وہی سامان ،
وہی زمین ، وہی آسمان ، وہی برسات ، وہی فواکہ[1] و نباتات ، جملہ
اعضاء ، ہاتھ پاؤں آنکھ کان اپنی اپنی خدمت پر مستعد ، نہ ماندگی
نہ کسل ، نہ تکان ۔ پس جبکہ خدا ایسے ایسے گناہ اور ایسی ایسی
نافرمانیوں پر نیکی سے نہیں چوکتا تو یہ بات اس کی ذات ستودہ[2] صفات
سے بہت ہی مستبعد[3] معلوم ہوتی ہے کہ اُس کی درگاہ میں معذرت
کی جائے اور نہ بخشے ۔ توبہ کی جائے اور قبول نہ کرے ۔ اُسی وقت
میاں بی بی دونوں نے دعا کے واسطے ہاتھ پھیلا دیے اور گڑ گڑا
گڑ گڑا کر اپنے اور ایک دوسرے کے گناہوں کی مغفرت چاہی ۔
اس کے بعد فہمیدہ مسرت و اطمینان کی سی باتیں کرنے لگی مگر نصوح
کی افسردہ دلی بدستور باقی تھی ۔ تب فہمیدہ نے پوچھا کہ جب توبہ
کرنے سے گناہوں کا معاف ہو جانا یقینی ہے اور آئندہ کے واسطے ہم
عہد کرتے ہیں کہ پھر ایسا نہ کریں گے تو کیا وجہ ہے کہ تم اُداس ہو؟

نصوح ۔ ایمان خوف و رجا[4] کا نام ہے ۔ توبہ کا قبول کیا جانا
کچھ ہمارا استحقاق نہیں ۔ خدائے تعالیٰ قبول کرے تو اُس کی عنایت
ہے اور قبول نہ کرے تو ہم کو نہ مقامِ گلہ ہے نہ محلِ[5] شکایت ۔ آئندہ
کے عہد پر بھی کیا بھروسہ ہو سکتا ہے ۔ انسان مخلوق ضعیف البنیان[6]
ہے غفلت اُس کی طینت ہے اور نافرمانی اُس کی طبیعت ۔ خدا ہی

[1] میوے [2] قابل [3] دور [4] اُمید [5] موقع ۔ جگہ [6] کمزور بنیاد مخلوق ۔

توفیق[1] خیر دے تو عہد کا نباہ اور وعدے کا ایفا ممکن ہے، ورنہ آدمی سے کیا ہو سکتا ہے۔ رُباعی

کیا فائدہ فکرِ بیش وکم سے ہوگا
ہم کیا ہیں کہ کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہُوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اور میری افسردگی کی ایک وجہ اور ہے کہ کسی طرح اس سے میرا قلب مطمئن نہیں ہوتا۔

فہمیدہ - وہ کیا؟

نصوح - وہ یہ ہے کہ میں تو بگڑا ہی تھا۔ میں نے ان بچوں کو کیسا غارت کیا۔ میری دیکھا دیکھی یہ بھی گئے گزرے ہوئے، تم دیکھتی ہو کہ چھوٹے بڑے سب ایک رنگ۔ میں ہیں کسی کو بھی دینداری سے مس[2] ہے؟ کوئی بھی خدا پرستی کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ اور رغبت ہو تو کہاں سے ہو نہ تو گھر میں دین و مذہب کا چرچا کہ خیر دوسروں کو دیکھ کر آدمی نصیحت پکڑے۔ نہ کوئی کہنے اور سمجھانے والا کہ نیک و بد کا امتیاز سکھائے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ میں ان کی تباہی اور خرابی میں ہر طرح کی مدد کرتا رہا۔ افسوس ہے کہ میں نے اُن کے حق میں کانٹے بوئے، اُن کے ساتھ دشمنی کرتا رہا اور جانا کہ میں اُن کی

[1] نیک [2] لگاؤ

بہتری چاہتا ہوں۔ میں جو غور کرتا ہوں تو کھیل کود کی جتنی خراب عادتیں ہیں، حقیقت میں اُن کا بانی اور معلّم میں ہوں۔ میں نے اُن کا جی بہلانے کو کھلونے اور کنکوّے لے لے دیے۔ میں اُن کو خوش کرنے کی نظر سے بازار ساتھ لے گیا۔ میں نے اُن کو دام دے دے کر بازاری سودوں کی چاٹ لگائی۔ جانور پالنے اُن کو میں نے سکھائے۔ میلے تماشے اُن کو میں نے دکھائے۔ خوش وضعی خوش لباسی کی لت اُن کو میں نے ڈلوائی۔ میں خود عیب مجسّم کا ایک بڑا نمونہ اُن کے پیشِ نظر تھا، جو کچھ یہ کرتے ہیں ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آئے مجھ سے سیکھا۔ میری تقلید کی۔ میں ہرگز اس نعمت کے لائق نہ تھا کہ مجھ کو بچّوں کا باپ بنایا جائے۔ میں کسی طرح اس عنایت کے شایاں نہ تھا کہ مجھ کو ایک بھرے کنبے کی سرداری ملے۔ یہ بھی میرے نصیبوں کی شامت اور اُن کی بدقسمتی تھی کہ اُن کی پرداخت مجھ کو سپرد ہوئی۔ افسوس سنِ تمیز کو پہنچنے سے پہلے یہ یتیم کیوں نہیں ہو گئے۔ شیر خوارگی[1] ہی میں میرا سایۂ زبوں اُن کے سر پر سے کیوں نہیں اُٹھا لیا گیا کہ کوئی دوسرا ان کی تربیت کا متکفل[2] ہوتا جو اپنی خدمت کو مجھ سے بدرجہا بہتر انجام دیتا۔ غضب ہے کہ یہ اشراف کے بچّے کہلائیں اور پاجیوں کی سی عادتیں رکھیں، مجھ کو اب ان کی شکل زہر معلوم ہوتی ہے۔ صورت، سیرت، ظاہر،

[1] دودھ پینے کا زمانہ [2] ذمہ دار

باطن، ایک سے ایک خراب، ایک سے ایک بدتر۔

ایک نابکار کو دیکھو، کہ وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھا ہی رہتا ہے۔ کبھی سینے پر نظر ہے، کبھی بازوؤں پر نگاہ ہے، آدم زاد ہو کر لقّے[1] کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے۔ اتنا اکڑتا ہے، اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدّی میں جا لگی ہے۔ کپڑے ایسے چُست کہ گویا بدن پر سِئے گئے ہیں۔ چھاتی پر انگرکھے کے بند ہیں۔ گھٹنوں تک پائجامے کی چوڑیاں پڑی ہیں۔ ایک دیولی برابر ٹوپی ہے کہ خود بخود گری پڑتی ہے۔ دوسرا ناہنجار صبح اٹھا اور کبوتر کھول باپ دادے کا نام اچھالنے کوٹھے پر چڑھا۔ پھر سوا پہر دن چڑھے تک کوٹھے پر دھما چوکڑی مچائی۔ مارے باندھے مدرسے گیا۔ عصر کے بعد سے پھر کوٹھا ہے اور کنکوّا ہے۔ شام ہوئی اور شطرنج بچھا اتوار کو مدرسے سے چھٹی ملی تو بٹیریں لڑائیں۔ تیسرے نالائق، بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ، محلّہ نالاں، ہمسائے عاجز۔ اس کو مار، اس کو چھیڑ، چاروں طرف ایک تراہ تراہ[2] مچ رہی ہے۔ غرض کچھ اس طرح کے بے سرے بچّے ہیں۔ ناہموار، آوارہ، بے ادب، بے تمیز، بیحیا، بے غیرت، بے ہنر، بدمزاج، بدزبان، بدوضع کہ چند روز سے دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے۔ ان کی حرکات وسکنات نشست وبرخاست، کوئی بھی تو بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ گالی دینے میں

[1] ایک قسم کا کبوتر جس کی گردن ہر وقت اکڑی رہتی ہے۔ [2] فریاد، دہائی، پکار۔

ان کو باک نہیں ۔ فحش بکنے میں ان کو تامّل نہیں ۔ قسم ان کا تکیہ کلام[1] ہے ۔ نہ زبان کو روک ہے نہ منھ کو لگام ہے ۔ ان کی چال ہی کچھ عجب طرح کی اُکھڑی اکھڑی ہے کہ بے تہذیبی اُن کی رفتار سے ظاہر ہے ۔

رہیں لڑکیاں ، میں تسلیم کرتا ہوں کہ اُن میں اس طرح کے عیوب نہ ہوں گے جو لڑکوں میں ہیں لیکن ساتھ ہی مجھ کو اس کا تیقّن[2] ہے کہ دیندارانہ زندگی تو کسی کی بھی نہیں ۔ ان کو بھی اکثر گڑیوں میں مصروف پاتا ہوں یا کنبے میں کوئی تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو کپڑوں کا اہتمام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں ۔ لڑکے گالیاں بہت بکتے ہیں تو لڑکیاں کوسنے کثرت سے دیا کرتی ہیں قسم کھانے میں جیسے وہ بے باک ہیں یہ بھی بیدھڑک ہیں ۔ بہرکیف کیا لڑکے کیا لڑکیاں میرے نزدیک تو دونوں کچھ ایک ہی طرح کے ہیں ، ان سب کی یہ تباہ حالت دیکھ کر میں زہر کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں مگر پھر دیکھتا ہوں تو ان کا کچھ بھی قصور نہیں ۔ خطا اگر ہے تو میری ہے اور تمھاری ۔ ان کے عیوب پر جھڑکنا اور ملامت کرنا کیسا ہم نے کبھی ان کو روکا تک بھی تو نہیں ۔

فہمیدہ ۔ تم تو باہر کے اٹھنے بیٹھنے والے ٹھہرے ۔ اس میں تو

---

[1] جو الفاظ بلا قصد ہر بات کے بعد یا شروع میں اکثر استعمال ہوتے ہیں ، مثلاً گویا ۔ کیا نام ۔ بات یہ ہے ۔ وغیرہ [2] یقین ۔

میرا ہی سراسر قصور ہے۔ بچّے ابتدا میں ماؤں ہی سے زیادہ مانوس ہوتے
ہیں اور ماؤں ہی کی خو بو پکڑتے ہیں۔ بلکہ تم جب کبھی ان کو نصیحت
کرتے اور کسی بات پر گھڑکتے تو میں اُلٹی اُن کی حمایت لیتی تھی۔ ان
سب کو میں نے خراب کیا اور اس کا الزام بالکل میری گردن پر ہے۔

نصوح۔ بیشک تم نے بھی ان کی اصلاح میں کوشش نہیں
کی لیکن پھر بھی میں باپ تھا تم سے ان کی پرورش متعلق تھی اور مجھ سے
ان کی اصلاح و تہذیب۔

فہمیدہ۔ ہاں میں نے ان کے بدنوں کو پالا اور ان کی روحوں کو
تباہ و ہلاک کیا۔ میری ہی بیہودہ محبّت نے اُن کی عادتیں بگاڑیں
میرے ہی نامعقول لاڈ پیار نے ان کے مزاجوں کو گندہ ان کی طبیعتوں
کو بے قابو بنایا۔

نصوح۔ لیکن اگر میں اپنے کام پر آمادہ و سرگرم ہوتا تو ممکن
نہ تھا کہ میں کہوں اور نہ سُنیں۔ میں چاہوں اور نہ کریں۔ آخر میں
ان پر ضابط[1] تھا۔ میں ان پر ہر طرح کی قدرت رکھتا تھا۔ اور نہ صرف
ان پر بلکہ تم پر اور سارے گھر پر۔

فہمیدہ۔ پھر بھی جس قدر بُرائیاں مجھ پر ظاہر ہوتی رہتی تھیں
اُن کا شاید دسواں حصّہ بھی تم پر منکشف نہ ہوتا ہوگا۔ جان بوجھ کر
میری عقل پر پردہ پڑ گیا۔ دیکھتی بھالتی میں اندھی بنی رہی۔ اب بھی

[1] قابض

جو جو خرابیاں اُن کی ہیں جانتی ہوں تم کو معلوم نہیں۔ دیکھو لڑکیاں ہی ہیں کہ تم گڑیاں کھیلنے اور کپڑے کا اہتمام کرنے کے سوائے اُن کے حالات سے محض بےخبر ہو۔ میں جانتی ہوں کہ اُن کے مزاجوں میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ ان کی عادتوں میں کیسے کیسے بگاڑ ہیں۔

نصوح پھر آخر کیا کرنا ہوگا؟

فہمیدہ۔ میرے گمان میں ان بچوں کی اصلاح تو اب ہمارے امکان سے خارج ہے۔

نصوح۔ البتہ ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہونے میں بھی کچھ شک نہیں۔

فہمیدہ۔ دشوار تمھیں کہو۔ آسمان[۱] میں تھگلی کا لگانا ممکن ہے اور ان کی اصلاح ممکن نہیں ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر یہ دُرست ہونے والے نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کلیم ایک ایک بات کے تو تو جواب دینے کو موجود ہے اور ایک کلیم پر کیا الزام ہے جتنے بڑے اتنے کڑے جتنے چھوٹے اتنے کھوٹے۔

نصوح۔ تو کیا اُن کو اُسی گمراہی میں رہنے دیں کہ اور بدتر ہوں اُن کو باختیار خود چھوڑ دیں کہ پیٹ[۲] بھر کر خراب ہوں۔

فہمیدہ۔ بڈھے طوطوں کا پڑھنا پکی لکڑی کا لچکانا۔ تم سے ہو سکے تو بسم[۳] اللہ۔ کیا خدانخواستہ میں مانع و مزاحم ہوں مگر میں ایسی

[۱] مشکل سے مشکل کام [۲] جی کھول کر۔ خوب [۳] اللہ کا نام لیکر شروع کرو۔

اَن ہونی کا بیڑا نہیں اٹھاتی - ایاز قدرِ خود بشناس[1] - میں خوب جانتی ہوں کہ بیٹوں کی نظروں میں میرا کتنا وقر[2] ہے - بیٹیاں کتنا میرا ادب لحاظ کرتی ہیں - رشتے میں ماں ضرور ہوں مگر افتادسے مجبور ہوں - کوئی میرے بس کا نہیں -

نصوح - لیکن تم خود کہتی تھیں کہ بچوں کی اصلاح تم پر فرض تھی اور جب تک مادری و فرزندی کا تعلق باقی ہے وہ فرض تمہاری گردن پر لدا ہے - میں نے ایک دن بڑے سویرے نہیں معلوم کس بچے کو چاہا کہ باہر حکیم کو لے جاکر دکھا دوں - تم اُس وقت اُس کا منھ دھلانے کو اٹھیں - میں جلدی کرتا تھا اور تم کہتی تھیں کہ ذرا صبر کرو منھ دُھلا دوں - کرتا بدل دوں - اس حالت سے لیجاؤ گے تو حکیم صاحب کیا کہیں گے کہ گھر والی کیسی پھوہڑ ہے کہ بچوں کو ایسا ناصاف رکھتی ہے - بیشک وہ بات تمہاری بہت معقول تھی لیکن جب یہ تمہارے بچے گندی روح اور ناپاک دل لیکر خُدا کے حضور میں جائیں گے تو کیا تم پھوہڑ نہیں بنوگی وہاں یہ معذوری اور مجبوری کچھ نہیں سُنی جائے گی - علاوہ اس کے کیونکر تمہاری محبت اقتضا[3] کرتی ہے کہ تم اپنے فرزندوں کو مبتلائے مصیبت دیکھو اور اُن کو اُس مصیبت سے نکالنے کی کچھ تدبیر نہ کرو - اس واسطے کہ وہ مصیبت اُن پر بہت دنوں سے ہے اور میرے اور تمہارے سبب سے ہے'

[1] ایاز اپنی قدر سمجھ [2] عزت [3] تقاضا -

کیا مدت کے بیمار کو دوا نہیں دیتے ؟ پُرانے ناسور کا علاج نہیں کرتے ؟ اولاد کی اصلاح ماں باپ پر فرض ہے ۔ اگر اس فرض کو ہم نے غفلت اور بیوقوفی سے اب تک ادا نہیں کیا تو کیا ضرور ہے کہ آئندہ بھی معصیت ترک فرض میں گرفتار رہیں ۔

فہمیدہ ۔ کچھ مجھ کو انکار نہیں ۔ گریز نہیں ۔ نہ میں یہ کہتی ہوں کہ بچوں کی اصلاح ہم پر فرض نہ تھی یا اب نہیں ہے بلکہ مجھ کو اُن کی اصلاح سے یاس کلی ہے اور میں جانتی ہوں کہ اُن کی اصلاح و تہذیب اور تادیب[1] و تعلیم میں کوشش فضول ہے ۔ سعی عبث ۔ تدبیر بے سود ۔ محنت رائگاں ۔ بھلا کہیں ٹھنڈے لوہے بھی پیٹنے سے درست ہوئے ہیں ۔

نصوح ۔ آہا ، لیکن ہم پر اسی قدر لازم ہے کہ کوشش کریں اور نتیجے کا مترتب ہونا اثر کا پیدا کر دینا ہمارا کام نہیں ۔ یہ خدا کے اختیار میں ہے اور کون جانے کہ خدا ہمارے ارادے میں برکت ۔ ہماری تدبیر میں تاثیر دے اور یہ درست ہو جائیں تو کیا تم کو مسرت نہ ہوگی ؟ کوشش میں ناکام رہنا اور مطلقاً کوشش نہ کرنا ان دو باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ، انجام دونوں کا ایک ہو مگر کوشش کرنا ہمارے لئے ایک برأت ہے ۔

فہمیدہ ۔ اس بات کا فیصلہ میرے اور تمہارے درمیان میں

[1] ادب دینا ۔ ادب سکھانا ۔

ہونا ممکن نہیں، اس واسطے کہ میری حالت اور ہے اور تمھاری حالت اور اوّل تو بچوں پر تمھارا رعب داب ہے۔ تم سے بھی ڈرتے ہیں اور میرے ساتھ تو سب کے سب اس قدر گستاخ ہیں کہ بیٹیاں تو خیر مجھ کو برابر کی سہیلی سمجھتی ہیں۔ بیٹے تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ کون بلا ہے اور یہ کیا بکتی ہے دوسرے تم کو اپنے بچوں کی کیفیت بخوبی معلوم نہیں اور میں ان کے رگ وریشے سے واقف ہوں۔

نصوح۔ یہ سب سچ ہے لیکن تمھاری تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اب اُن کی اصلاح بڑا مشکل کام ہے؟

فہمیدہ۔ پھر تم نے بات کو بدلا۔ میں نے اپنے منھ سے مشکل ہرگز نہیں کہا۔ میں شروع سے ناممکن اور محال ہی کہے جاتی ہوں۔

نصوح۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر سے میں تمھارے ساتھ بک رہا ہوں اور تم نہیں سمجھتیں۔ کیوں صاحب! ناممکن اور محال کیوں ہے؟

فہمیدہ۔ اگر تم کہو، میں تمھاری خاطر سے مان لوں لیکن چونکہ تم میری رائے پوچھتے ہو تو میں بیشک ناممکن اور محال ہی سمجھتی ہوں اور وجہ یہ کہ اُن کی عادتیں راسخ ہوتے ہوتے طبیعت ہو گئی ہیں، برابر کے بیٹے، برابر کی بیٹیاں۔ مار ہم نہیں سکتے، گھرک ہم نہیں سکتے، جبر ہم نہیں کر سکتے، بھلا پھر ان عادتوں کو جن کے وہ مدتوں سے خوگر ہو رہے ہیں کیونکر چھُڑا دیں گے؟

نصوح - تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ کوئی تدبیر کارگر سمجھ میں نہیں آتی اور جو سمجھ میں آتی ہے وہ کارگر نہیں معلوم ہوتی -

فہمیدہ - وہ ایک ہی بات ہے -

نصوح - اس سے مجھ کو بھی انکار نہیں کہ معمولی تدبیریں اب محض بے سود ہیں - مادّہ سخت ہے تو جلاّب بھی کوئی بڑا کڑا دینا ہوگا جو کام پہلے ایک بات سے نکلتا اب جوتی لات سے بھی نکلنے کی اُمید نہیں -

فہمیدہ - لیکن اگر بچّوں کے ساتھ تم اس طرح کی سختی برتو گے تمام دُنیا تھُڑی[1] تھڑی کرے گی اور سختی سے بچّوں کے دلوں میں دونی ضد اور نفرت پیدا ہوگی -

نصوح - اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اپنے ذمّے کا ایک فرض ادا کرتا ہوں تو دُنیا کے کہنے کی انشاءاللہ مجھ کو مطلق پروا نہ ہوگی لوگوں کو اختیار ہے جو چاہیں سمجھیں اور جو چاہیں سو کہیں لیکن سختی خود میرے نزدیک ایک تدبیر مناسب ہے اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ بڑے لڑکے کسی طرح سختی کی برداشت نہیں کر سکتے اور اگر اُن کے ساتھ خشونت[2] اور درشتی[3] سے پیش آؤں گا تو بالکل اُلٹا اثر ہوگا اور جبکہ میں خود اُن کی خرابی کا باعث ہوا ہوں تو سختی کا میں سزاوار ہوں، نہ وہ -

---

[1] نفرین اور ملامت [2] کھرّاپن [3] سختی

فہمیدہ - بھلا پھر سختی کروگے نہیں اور نرمی سے کام نکلنا نہیں۔ اسی نرمی نے تو اُن کو اس ہڈڑے تک پہنچایا - تو آخر وہی بات ہوئی کہ ہونا ہوانا کچھ نہیں، ناحق کا دردِسر ہے

نصوح - میں اس شعر پر عمل کروں گا ؎

درشتی[1] و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ است

نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کے محل پر سختی، اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ انشاء اللہ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہوں گا - آخر آدمی کے بچّے ہیں - بات کو سمجھتے ہیں - عقل رکھتے ہیں - جب اُنھیں کے فائدے کی بات میں اُن سے کہوں گا تو کب تک نہ سمجھیں گے اور سختی تو بس اسی قدر میں عمل میں لاؤں گا کہ یہ بات بخوبی اُن کے ذہن نشین کردوں گا کہ جو میرے کہے کا نہیں میں اُس کا اور وہ میرا شریکِ رنج و راحت نہیں ہے - یہی کہوں گا اور انشاء اللہ یہی کر دکھاؤں گا مگر بے تمھاری مدد کے یہ ارادہ پورا نہیں ہوسکتا -

فہمیدہ - میں دل وجان سے مدد کرنے کو موجود ہوں، میں جانتی ہوں کہ تم اُنھیں کی بہتری کے واسطے کہتے اور کرتے ہو اپنی اولاد کا فائدہ ہوتے سُہاتے اگر میں کوتاہی کروں تو ماں کاہے کو کوئی،

---

[1] سختی اور نرمی دونوں کو ملا کر کام لینا بہتر ہے کیونکہ جرّاح فصد بھی کھولتا ہے اور مرہم بھی لگاتا ہے (جب ہی تو فائدہ ہوتا ہے) -

کوئی ڈائن ہوئی۔

نصوح۔ تم میرے شریک حال رہو تو مجھ کو ہر طرح کی تقویت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بچے بات بات میں تمھارا آسرا تمھارا سہارا پکڑتے ہیں۔ ہو میری بی بی مگر معاملات خانہ داری میں میرے کل فیصلوں کی اپیل تمھارے یہاں ہوتی ہے۔ میں تم کو الزام نہیں دیتا۔ اس واسطے کہ تم سے زیادہ میں خود ملزم ہوں لیکن بچوں میں سے جس کو تم نے زیادہ پیار کیا وہی زیادہ خوار ہوا۔ ہر چند میں نے کوشش کی کسی امر دینی کے واسطے نہیں بلکہ معمولی پڑھنے لکھنے کے واسطے مگر جب تک تمھاری تائید نہیں ہوئی ایک نہیں چلی۔

فہمیدہ۔ لیکن اب وہ کیفیت نہیں ہے۔ جب تک چھوٹے سے تھے مجھ کو ماں سمجھتے تھے اور میں اُن کی فریاد لیتی تھی۔ حمایت کرتی تھی اب ہر ایک اپنے دل کا بادشاہ ہے۔ لڑکوں سے تو کچھ تعلق ہی نہیں رہا۔ ہفتوں بات چیت کرنے کا اتفاق بھی نہیں ہوتا۔ پکارتی پکارتی رہ جاتی ہوں۔ مُنھ پھیر کر بھی نہیں دیکھتے، لڑکیاں البتہ کہاں جائیں اور کس کے پاس جائیں۔ گھر ہی میں بیٹھی کھیلا کرتی ہیں۔ میں گھر کے کام دھندے میں لگی رہتی ہوں لیکن پھر بھی جہاں تک تمھارے نیک ارادے ہیں کہ خدا اُس کو پورا کرے مجھ سے مدد مل سکتی ہے، تم دیکھ لینا، انشاء اللہ، اپنے مقدور بھر اُٹھا نہ رکھوں گی۔

نصوح۔ بھلا چھوٹے چھوٹے بچوں کو تو سنبھال لو گی؟

فہمیدہ - ان کا درست کر لینا کیا مشکل ہے - یہ تو موم کی ناک ہیں جدھر کو پھیر دو پھر گئے - بلکہ شاید ان کو منہ سے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہو - بچّوں کا قاعدہ ہے کہ جیسا بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں خواہ مخواہ اُس کی نقل کرنے لگتے ہیں - ابھی تھوڑی دیر ہوئی حمیدہ نے مجھ کو رُلا رُلا دیا ہے - کیا تو اس کی چھ برس کی بساط ہے مگر ماشاء اللہ، میرے منہ میں خاک، مغز سے اُتار کر بڑے بوڑھوں کی سی باتیں کرتی ہے -

نصوح - کیا ہوا تھا ؟

03

فصل سوم

فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی گفتگو

فہمیدہ ۔ تم کو جو اب چند روز سے نماز پڑھتے دیکھتی ہے، تو پرسوں مجھ سے پوچھنے لگی کہ امّاں جان! دن میں کئی مرتبہ ابّا جان ہاتھ منھ دھو کر یہ کیا کیا کرتے ہیں۔ پہلے دیر تک بڑے ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ پھر جھکتے ہیں، پھر منھ کے بل گر پڑتے ہیں؟

میں ۔ بیٹی! نماز پڑھتے ہیں ۔

حمیدہ ۔ اماں جان! نماز کیا؟

نماز کو استعجاب[1] کے ساتھ پوچھنا یہ پہلی چٹکی تھی کہ اس نے میرے دل میں لی ۔

میں ۔ بیٹی! خدا کی عبادت کو نماز کہتے ہیں ۔

حمیدہ ۔ امّاں جان! خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس کی کون ہے؟ اس کا بھولے پن سے یہ پوچھنا تھا کہ خدا کیا چیز ہے اور عبادت

---

[1] تعجب ۔ اچنبھا ۔

اُس کی کون ہے کہ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں۔ کیوں! کیا تم خدا کو نہیں جانتیں؟

حمیدہ۔ میں سب لوگوں کو خدا کی قسم کھاتے تو سنتی ہوں، اور جب کبھی امّاں جان تم خفا ہوتی ہو تو کہا کرتی ہو "خدا کی مار" اور "تجھ سے خدا سمجھے" شاید خدا بیچا[1] کو کہتے ہیں۔ مگر بیچا ہوتی تو اُس کی قسم نہ کھاتے۔

میں۔ حمیدہ توبہ کرو توبہ، خدا بیچا نہیں ہے۔ خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی روزی دیتا ہے، وہی مارتا ہے، وہی جلاتا ہے۔ وہی پالتا ہے۔

حمیدہ۔ کیا امّاں جان تم کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے؟

میں۔ ہاں، مجھ کو بھی۔

حمیدہ۔ اور ابّا جان کو بھی؟

میں۔ ہاں، تمھارے ابا جان کو بھی؟

حمیدہ۔ اور ننّی بُوا کو بھی؟

میں۔ ہاں، ننّی بُوا کو بھی۔

حمیدہ۔ امّاں جان کیا ہر روز ہمارے گھر میں کھانا نہیں پکتا؟

میں۔ کیوں نہیں پکتا؟

حمیدہ۔ پھر تم تو کہتی ہو کہ خُدا سب کو کھانے کو دیتا ہے؟

---

[1] ایک فرضی نام ہے جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں۔

میں ۔ اللہ میاں پانی برساتے ہیں ۔ اللہ میاں غلّے اور میوے اور ترکاریاں ہم لوگوں کے واسطے زمین میں اُگاتے ہیں ۔ وہی ہم سب لوگ کھاتے ہیں ۔

حمیدہ ۔ ننّی بُوا کو تو امّاں جان تم دودھ پلاتی ہو؟

میں ۔ دودھ بھی اللہ میاں ہی اتارتے ہیں ۔ تمھاری ہی دفعہ اسی دُودھ کے پیچھے برسوں مصیبت اٹھائی ۔ چھٹی تک الغاروں[1] دُودھ تھا ۔ چھٹی نہا کر اٹھی کہ یکایک جاڑا چڑھا ۔ بخار آیا ۔ تو کس شدّت کا کہ الامان! تمام بدن سے آنچ نکلتی تھی ۔ وہ پہر بھر کا بخار آنا اور دودھ کا تاؤ کھا جانا ۔ پھر بہتیری ستاول[2] پھانکی ۔ زیرہ پیا ۔ حکیم کا علاج کیا ۔ تمھارے دادا جان خدا جنّت نصیب کرے ہر روز طشتری[3] لکھ دیا کرتے تھے مگر دودھ کچھ ایسی گھڑی کا سوکھا تھا کہ پھر نہ اُترا پر نہ اُترا جب دیکھا کہ بچّی بھوک کے مارے پھڑکی چلی جاتی ہے ۔ ناچار انّا رکھی اور وہ عذاب اُٹھائے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے خدا نے زندگی بخشی کہ تم پل گئیں ۔

حمیدہ ۔ تو اللہ میاں بڑے اچھے ہیں ، ہم سب کو کھانے کو دیتے ہیں ۔ ہماری ننّی بُوا کے واسطے دودھ اُتارتے ہیں لیکن امّاں جان اللہ میاں سے ہمارا کچھ رشتہ ناتا ہے کہ اتنے سلوک کرتے ہیں ؟

---

[1] بے انتہا ۔ بہت زیادہ [2] ستاول یا ستاور ایک دوا کا نام ہے جو دودھ بڑھاتی ہے [3] چینی کی طشتری پر آیاتِ قرآن اور دعائیں لکھ کر دھو کر پلاتے ہیں جس سے دودھ بڑھ جائے

میں ۔ رشتہ ناتا یہ کہ ہم اُن کے بندے ہیں ۔ مرد اُن کے غلام ہیں ۔ عورتیں اُن کی لونڈیاں ہیں ۔

حمیدہ ۔ لونڈی غلاموں کے ساتھ اتنا سلوک کہ کوئی اپنے بچوں کے ساتھ بھی نہیں کرتا لیکن لونڈی غلام تو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہیں ۔ ٹہل کرتے ہیں ۔ ہم اللہ میاں کا کون سا کام کرتے ہیں؟

میں ۔ یہی نماز جو تم نے اپنے باپ کو پڑھتے دیکھی اور جس کو عبادت کہتے ہیں ۔

حمیدہ ۔ ہاں ، نماز اللہ میاں کا کام ہے تو سبھی کو نہ پڑھنی چاہیئے ۔ کیونکہ لونڈی غلام سب ہیں ۔ اللہ میاں کی دی ہوئی روٹی سب کھاتے ہیں؟

میں ۔ بیشک خدا کی عبادت سب پر فرض ہے ۔

حمیدہ ۔ اماں جان تم تو نماز نہیں پڑھتیں ۔ کیا تم اللہ میاں کی لونڈی نہیں ہو؟ اور کیا تم اُس کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتیں؟

حمیدہ نے جو سادہ دلی اور بھولے پن سے یہ الزام دیا مجھ کو اس قدر شرم آئی کہ زمین پھٹ گئی ہوتی تو میں سما جاتی ۔

میں ۔ میں لونڈی بیشک ہوں اور خدا ہی کی دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں لیکن کیا بعضی لونڈیاں نکمی اور کام چور اور نمک حرام اور بے غیرت نہیں ہوتیں ۔ ویسی ہی اللہ میاں کی ایک لونڈی میں ہوں ۔

حمیدہ - ابّا جان بھی تو اب بیماری سے اٹھ کر نماز پڑھنے لگے ہیں،
کیا اس سے پہلے وہ خدا کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتے تھے؟
یہ سُن کر نصوح کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے -
میں - وہ بھی بُرا کرتے تھے -
حمیدہ - اچھی امّاں جان اللہ میاں خفا ہوئے ہوں گے؟
میں - خفا ہونے کی تو بات ہی ہے -
حمیدہ - ایسا نہ ہو روٹی بند کر دیں تو پھر ہم کہاں سے کھائیں گے
اور اگر ننّی بُوا کا دودھ سوکھ جائے گا تو ہماری ننّی روئے گی۔ یہ کہہ کر
حمیدہ رونے لگی۔ میں نے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور پیار کیا -
لیکن جس قدر میں اُس کو تسلّی دیتی تھی وہ اور دُگنا روتی تھی۔ مجھ سے
بھی ضبط نہ ہو سکا اور مجھ کو روتے دیکھ کر وہ اور بھی بیتاب ہو گئی -
آخر بڑی مشکلوں سے میں نے اُس کو سنبھالا اور کہا کہ حمیدہ تم ڈرو
مت - اللہ میاں کا یہ دستور نہیں ہے کہ جو لونڈی غلام کام نہ کریں
اُن کا کھانا بند کر دیں -
حمیدہ - سچ؟
میں - ہاں ہاں تم گھبراؤ مت -
حمیدہ - اچھی امّاں جان ننّی کو پلا کر دیکھو دُودھ ہے یا نہیں؟
میں - بیٹی! ننّی کو سونے دو اور دودھ سے اطمینان رکھو،
دُودھ خدا کا دیا ہوا بہت -

حمیدہ ۔ ہمارے گھر میں تو لونڈی غلام نہیں ۔ نوکر چاکر ہیں ۔ مگر کام نہیں کرتے تو تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے ۔ ابّا جان جُرمانہ کر دیا کرتے ہیں ۔ گھر سے نکال دیتے ہیں ۔ اللہ میاں اپنے لونڈی غلاموں پر بھی خفا نہیں ہوتے تو ایسے مالک کا کام تو اور بھی جی لگا کر کرنا چاہیئے ۔ کیا کام نہ کرنا اور کھانا بے غیرتی نہیں ہے ؟

میں ۔ بڑی بے غیرتی کی بات ہے ۔

حمیدہ ۔ امّاں جان ! میں نے تو آج تک نماز نہیں پڑھی اور نہ مجھ کو نماز پڑھنی آتی ہے اور تم تو دن رات میں دو ہی مرتبہ کھانا کھاتی ہو، میں نہیں معلوم کتنی دفعہ کھاتی ہوں ۔ مجھ پر اللہ میاں ضرور خفا ہوئے ہوں گے ؟

یہ کہہ کر پھر حمیدہ روئی اور ڈر کے مارے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھر میں نے سمجھایا کہ حمیدہ ڈرو مت ۔ اللہ میاں تم سے ناخوش نہیں ہیں ۔ ابھی تم بچّی ہو ۔ تم کو نماز معاف ہے ۔

حمیدہ ۔ کھانا تو مجھ کو بھی سب کے برابر بلکہ سب سے اچھا اور زیادہ ملتا ہے ؟

میں ۔ ہاں ملتا ہے اور یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ تم کو کام معاف کر رکھا ہے ۔

حمیدہ ۔ پھر اللہ میاں مجھ کو کیوں کھانا دیتے ہیں ؟

میں ۔ اس واسطے کہ جب بڑی ہو جاؤ تو اُس کے بدلے کا

بہت سا کام کرو۔

حمیدہ۔ لیکن کیا میں اب کام نہیں کر سکتی۔ دیکھو میں تم کو پان بنا دیتی ہوں۔ ابّا جان کو پانی پلا دیتی ہوں۔ ننّی بوا کو بہلا لیتی ہوں۔ کیوں امّاں جان کرتی ہوں نا؟

میں۔ ہاں بوا ہاں! تم میرے بہت کام کرتی ہو۔ پنکھا جھل دیتی ہو۔ دھاگا بٹ دیتی ہو۔ سوئی میں دھاگا پرو دیتی ہو۔ جو چیز مجھ کو درکار ہوتی ہے، لے آتی ہو۔

حمیدہ۔ تو کیا میں اللہ میاں کا کوئی چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتی کیا نماز پڑھنا بڑا مشکل کام ہے؟ میں تو دیکھتی ہوں ابّا جان ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ کیا اتنا مجھ سے نہیں ہو سکتا؟

میں۔ اس کے سوائے کچھ پڑھنا بھی ہوتا ہے جس کو تم کہتی تھیں کہ چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے ہیں۔

حمیدہ۔ وہ کیا باتیں ہیں؟

میں۔ خدا کی تعریف اور اُس کے احسانوں کا شکریہ، اپنے گناہوں کا اقرار اور اس کی معافی کی درخواست، اُس کے رحم کی تمنّا، اُس کے فضل کی آرزو، بس یہی نماز ہے۔

حمیدہ۔ یہ سب باتیں اسی طرح نہ کرتے ہوں گے جیسے ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں؟

میں۔ اور کیا۔

حمیدہ ۔ مگر ابّا جان تو کچھ اور ہی طرح کی بولنے لگتے ہیں؟

میں ۔ وہ عربی زبان ہے ۔

حمیدہ ۔ وہ تو میری سمجھ میں نہیں آتی ۔ امّاں جان تم جانتی ہو؟

میں ۔ نہیں، میں بھی نہیں جانتی ۔

حمیدہ ۔ تو کیا خدا سے عربی ہی زبان میں باتیں کرنی ہوتی ہیں؟

میں ۔ نہیں وہ سب کی بولی سمجھتا ہے بلکہ وہ دلوں کے ارادوں اور طبیعتوں کے منصوبوں سے واقف ہے ۔

حمیدہ ۔ یہ کیونکر؟

میں ۔ اس واسطے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے ۔ کوئی چیز، کوئی بات اُس سے مخفی نہیں ۔ سب کو دیکھتا ہے ۔ سب کی سنتا ہے ۔ اگلے پچھلے کل حالات اُس کو معلوم ہیں ۔

حمیدہ ۔ (گھبرا کر) کیا اللہ میاں یہاں ہمارے گھر میں بھی بیٹھے ہیں؟

میں ۔ گھر میں کیا، ہمارے پاس بیٹھے ہیں مگر ہم اُن کو دیکھ نہیں سکتے ۔

یہ سُن کر حمیدہ نے جلدی سے اوڑھنی اوڑھ لی اور سنبھل کر مؤدّب ہو بیٹھی اور مجھ سے بھی آہستہ سے کہا ”امّاں جان سر ڈھک لو۔ اس کے بعد حمیدہ پر کچھ ایسی ہیبت غالب آئی کہ میری گود میں تھوڑی دیر تک چپ پڑی رہی ۔ آخر آنکھ لگی سوگئی ۔ میری ٹانگیں سُن ہونے لگیں تو میں نے آہستہ سے چارپائی پر لٹا کر بیدارا کو پاس بٹھا دیا کہ دیکھ ہاتھ رکھے رہیو ۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکی سوتے سوتے ڈر کر چونک پڑے

اور میں یہاں چلی آئی - مجھ کو حمیدہ کی باتوں سے ایسا ڈر لگا تھا کہ اندر سے کلیجہ تھر تھر کانپا جاتا تھا۔

نصوح - کیوں ڈر کی اس میں کیا بات تھی ؟

فہمیدہ - میں کہتی تھی کہ ایسی چھوٹی سی لڑکی اور ایسی باتیں کچھ اس کو ہو تو نہیں گیا ؟ خدا کے اصول واضح اور صاف ہیں

نصوح - مذہب میں بڑی خوبی اور عمدگی تو یہی ہے کہ وہ ایسی باتوں کی تعلیم کرتا ہے جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے - مسائل دینی آدمیوں کے بنائے ہوئے مُعمّے اور لوگوں کی گڑھی ہوئی پہیلیاں نہیں ہیں کہ اُن کے حل کرنے اور بوجھنے کو بڑا غور و خوض درکار ہو بلکہ اُس حکیم برحق کے باندھے ہوئے اصول اور ٹھہرائے ہوئے ضابطے[1] ہیں اور اصول بھی کیسے سلیس اور آسان ضابطے سہل اور بدیہی - نہیں معلوم انسان کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ اتنی موٹی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، انواع و اقسام کے حیوانات، رنگ برنگ کے نباتات، ساری دُنیا، تمام زمانہ، اتنا بڑا کارخانہ، جس میں کا ایک پتّا اٹھا کر دیکھو تو ہزارہا صفتوں سے بھرا ہوا ہے - آخر خود بخود تو نہیں ہو گیا - ضرور کوئی اس کا بنانیوالا ہے اور پھر اُس نے جو انسان کو ایک خاص صفت عقل عطا کی ہے تو اس تخصیص[2] کا کیا مطلب ہے ؟ مگر ہے کیا کہ انسان اس تصوّر کو

[1] قاعدے [2] خصوصیت - انوکھاپن

اپنے ذہن میں آنے ہی نہیں دیتا ورنہ ساری خدائی خدا کی گواہی دے رہی ہے ؎

برگ[۱] درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

حمیدہ نے کوئی بات اچنبھے کی نہیں کہی۔ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں نادان بچوں کے برابر بھی عقل نہیں۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ زمین میں گڑ جانے کا مقام ہے۔ بلکہ حمیدہ کی باتوں کو میں ایک فال نیک اپنی کامیابی کی سمجھتا ہوں۔ افسوس ہے کہ تم اس کو میرے پاس نہ لے آئیں۔ اُس کی ہر ہر بات لوح دل پر کندہ کرنے کے لایق ہے اور یہ باتیں اُس نے کیا کہیں، خدا نے اُس کے مُنھ سے کہلوائیں۔ بیٹی کیا ہے، سچ پوچھو تو ہمارے لئے ہدایت کا فرشتہ ہے اور بچے جو معصوم کہلاتے ہیں اسی سبب سے کہ اُن کے دل کوث[۲] دنیا[۳] سے پاک اور تیرگی[۴] گناہ سے صاف ہوتے ہیں۔ الحمد للہ[۵] کہ ایک سے تو اطمینان ہوا۔

اب یہ بتاؤ کہ اوروں کے واسطے کیا انتظام کرنا ہوگا؟

فہمیدہ۔ تمھیں کوئی تجویز سوچو۔

نصوح۔ میں نے تو یہ سوچا ہے کہ لڑکیوں کو تم سنبھالو اور

---

[۱] سبز درختوں کے پتے ہوشیاروں کی نظر میں ایسے ہیں کہ جیسے ہر پتا خدا کی معرفت کا ایک دفتر ہے [۲] دُنیا کی محبت [۳] سیاہی [۴] خدا کا شکر ہے

لڑکوں کو میں سمجھ لوں گا۔

فہمیدہ۔ بھلا میں بھی تو سُنوں، کیونکر سمجھ لوگے کہ وہی تدبیر میں بھی کروں۔

نصوح۔ میں پہلے چھوٹوں سے شروع کروں گا۔ اُمید ہے کہ جلد راہ پر آجائیں۔ بڑوں کا مجھ کو بڑا کھٹکا ہے۔ یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ یہ نیا ڈھنگ دیکھ کر اُن کے کان کھڑے ہوں گے مگر نہیں معلوم کس سے کیا معاملہ پیش آئے۔ تم اتنا کرو کہ ایک تو میرا تمھارا دونوں کا کام ایک ساتھ شروع ہو، جب اندر باہر دونوں جگہ ایک ہی بات کا چرچا ہوگا تو کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ دیکھو خاصکر ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ اولاد اولاد سب برابر۔ اُن سے کچھ تعرّض[1] نہیں کرتے دوسرے یہ کہ تمھاری ہر ادا سے یہ بات پیدا ہو کہ اس معاملے میں ہم دونوں کو ایک اہتمام خاص ہے۔ کیونکہ ذرا سا ضعف بھی ظاہر ہوگا تو تمام تر انتظام درہم و برہم ہو جائے گا۔

فہمیدہ۔ انشاءاللہ اس کے خلاف نہ ہوگا۔

---

[1] روکنا ٹوکنا۔ مزاحمت کرنا ۱۲

۵۷

فصل چہارم

نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو

آج تو میاں بی بی میں یہ قول و قرار ہوا۔ اگلے دن چھوٹا بیٹا سلیم ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ بیدارا نے آجگایا کہ صاحبزادے اٹھئے تو بالاخانے پر میاں بلاتے ہیں۔ سلیم کی عمر اُس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سُنی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جلدی سے ہاتھ منھ دھو ماں سے آکر پوچھنے لگا۔ امّاں جان تم کو معلوم ہے، ابّا جان نے کیوں بُلایا ہے؟

ماں۔ بھائی مجھ کو تو کچھ خبر نہیں۔

بیٹا۔ کچھ خفا تو نہیں ہیں؟

ماں۔ ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں اُترے۔

سلیم۔ بیدارا! تجھ کو کچھ معلوم ہے؟

بیدارا۔ میاں میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی۔ میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا کہ ان کو بھیج دیجیو۔

سلیم۔ صورت سے کچھ غصّہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا؟

بیدارا۔ نہیں تو۔

سلیم۔ تو اماں جان ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔

ماں۔ میری گود میں لڑکی سوتی ہے۔ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ جاتے کیوں نہیں؟

سلیم۔ کچھ پوچھیں گے؟

ماں۔ جو کچھ پوچھیں گے تم اُس کا معقول طور پر جواب دینا۔

غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کرکے الگ جا کھڑا ہوا، باپ نے پیار سے بلا کر پاس بٹھالیا اور پوچھا۔ کیوں صاحب ابھی مدرسے نہیں گئے؟

بیٹا۔ جی، بس اب جاتا ہوں۔ ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اور ہے۔

باپ۔ تم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ؟

بیٹا۔ کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں۔

باپ۔ کیوں؟

بیٹا۔ اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے۔ چھوٹے بھائی جان اُسی کے واسطے تیاری کر رہے ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر کسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ وہاں اُن کو دیر ہو جاتی ہے تو پھر گھر بھی

نہیں آتے ۔ میں جاتا ہوں تو اُن کو ... سے میں پاتا ہوں ۔

باپ ۔ کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے. کہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں؟

بیٹا ۔ جگہ تو ہے مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہوا کرتا ہے ۔ اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا ۔

باپ ۔ تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو؟

بیٹا ۔ مُہرے پہچانتا ہوں ۔ چالیں جانتا ہوں مگر کبھی خود کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔

باپ ۔ مگر زیادہ دلوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے ؟

بیٹا ۔ شاید مجھ کو عمر بھر بھی شطرنج کھیلنی نہ آئے گی ۔

باپ ۔ کیوں ؟ کیا ایسی مشکل ہے ؟

بیٹا ۔ مشکل ہو یا نہ ہو ۔ میرا جی ہی نہیں لگتا ۔

باپ ۔ سبب ؟

بیٹا ۔ میں پسند نہیں کرتا ۔

باپ ۔ چونکہ مشکل ہے ۔ اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں ۔ مجھ کو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمھاری طبیعت خوب لگتی ہو گی وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے ۔

بیٹا۔ میں شطرنج کی نسبت گنجفہ کو زیادہ تر ناپسند کرتا ہوں۔

باپ۔ ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظہ پر۔

بیٹا۔ میری ناپسندیدگی کا کچھ خاصکر یہی سبب نہیں ہے بلکہ مجھ کو سارے کھیل بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

باپ۔ تمھاری اس بات سے مجھ کو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب سننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا؟

بیٹا۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا مگر اب تو مجھ کو ایک دلی نفرت ہوگئی ہے۔

باپ۔ آخر اُس کا کوئی سبب خاص ہوگا؟

بیٹا۔ آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے اندر گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا؟

باپ۔ وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں، چھڈی جوتیاں پہنے، منڈے ہوئے سر، اونچے پائجامے، نیچی چولیاں۔

بیٹا۔ ہاں جناب وہی چار لڑکے۔

باپ۔ پھر؟

بیٹا۔ بھلا آپ نے کبھی اُن کو کسی قسم کی شرارت کرتے بھی دیکھا ہے؟

باپ۔ کبھی نہیں۔

بیٹا۔ جناب کچھ عجب عادت اُن لڑکوں کی ہے۔ راہ میں چلتے ہیں تو گردن نیچی کیے ہوئے۔ اپنے سے بڑا مل جائے۔ جان پہچان ہو یا نہ ہو، اُن کو سلام کر لینا ضرور۔ کئی برس سے اس محلے میں رہتے ہیں مگر کانوں کان خبر نہیں۔ محلے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں لیکن اُن کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپس میں اوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں۔ نہ کبھی لڑتے نہ کبھی جھگڑتے نہ گالی بکتے نہ قسم کھاتے۔ نہ جھوٹ بولتے۔ نہ کسی کو چھیڑتے۔ نہ کسی پر آوازہ کستے۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ وہاں بھی اُن کا یہی حال ہے کبھی کسی نے اُن کی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے۔ لڑکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔

باپ۔ بھلا پھر؟

بیٹا۔ منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے، ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا۔ مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اُس کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے فرمایا کہ کمبخت گھر سے گھر ملا ہے اسی کے پاس جاکر یاد کر لیا کر۔ میں نے جو پوچھا "کیوں صاحب! یاد کروا دیا کروگے"؟

تو کہا۔ "بسر وچشم" غرض میں اگلے دن اُن کے گھر گیا۔ آواز دی۔ اُنھوں نے مجھ کو اندر بلا لیا۔ دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جائے نماز بچھائے قبلہ رو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں وہ ان لڑکوں کی نانی ہیں۔ لوگ اُن کو حضرت بی کہتے ہیں۔ میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے پاس جا بیٹھا۔ جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "بیٹا گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا۔ لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دعا دوں۔ جیتے رہو، عمر دراز، خدا نیک ہدایت دے۔" اُن کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اُٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ تب حضرت بی نے فرمایا "بیٹا بُرا مت ماننا، یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں اور میں تم کو نہ ٹوکتی لیکن چونکہ تم میرے بچّوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا۔" اس کے بعد حضرت بی نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی مدتوں میں اُن کے گھر جاتا رہا۔ حضرت بی بھی مجھ کو اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں۔ اور مجھ کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں تب ہی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹا ہو گیا۔

باپ۔ یہ تو تم نے اچھا اختصار[1] کیا، اجی سب باتیں مجھ کو سناؤ کیا کیا تم سے حضرت بی نے کہا؟

---

[1] مختصر کرنا۔ کم کرنا۔

بیٹا۔ ہر روز آنے جانے سے میں اُن لوگوں کے ساتھ خوب بے تکلّف ہو گیا مگر حضرت بی نے بس پہلے دن سلام نہ کرنے پر ٹوکا تھا۔ پھر کوئی گرفت نہیں کی۔ باوجودیکہ میں شوخی بھی کرتا تھا لیکن وہ خبر نہیں ہوتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے اور ایک ہمسایہ کے لڑکے سے باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے عین[1] انھیں کے دروازے پر لڑائی ہو پڑی۔ سخت کلامی کے بعد گالی گلوج کی نوبت پہنچی۔ پھر مار کٹائی ہونے لگی۔ لڑکا مجھ سے تھا کمزور۔ اڑنگے پر چڑھا جو ایک پٹخنی دیتا ہوں چاروں شانے[2] چت، پھر تو میں اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچا کو ایسے گھسّے دیے کہ یاد ہی کیے ہوں گے۔ اگر لوگ چھڑا نہ دیتے تو میں اُس کو ادھ موا کر ہی چکا تھا۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اُس پر سے اُتارا اور دو ایک نے میری پیٹھ بھی ٹھوکی کہ شاباش پٹھّے شاباش، لیکن وہ لڑکا ایسا چیند[3] باز تھا کہ پھر خم ٹھوک کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ پھر گُتھ جاؤں اتنے میں اندر سے اُسی میرے ہم جماعت نے آواز دی۔ اِدھر لوگوں نے کہا کہ میاں جانے بھی دو۔ یہ تمھارے جوڑ کا نہیں ہے غرض میں اندر چلا گیا۔ میرے ہم جماعت نے پوچھا کیوں جی! "کس سے لڑ رہے تھے"! میں نے کہا "میاں یہی کنجڑے والا رمضانی، کمزور مار کھانے کی نشانی لیکن خدا کی قسم میں نے بھی آج اُس ......[4] کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی تو کریگا۔

---

[1] ٹھیک [2] دونوں مونڈھے اور دونوں کُولھے مل کر چار شانے ہوئے [3] ضدّی۔ ہٹّی۔ بے ایمان [4] ایسی فحش گالی جو لکھنا ادب کے خلاف ہے۔

اُس وقت تک غصّہ اور طیش[۱] تو فرد ہوا ہی نہ تھا۔ نہیں معلوم کیا کیا میں نے بکا کہ سب گھر والوں نے سُن کر آنکھیں نیچی کرلیں اور بڑی دیر تک سرنگوں[۲] بیٹھے رہے۔ آخر حضرت بی بولیں کہ "سلیم بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو ایسا پیارا لڑکا اور گُن[۳] تیرے ایسے خراب۔ اس مُنھ سے ایسی باتیں؟ آج کئی دن سے میں تجھ کو سمجھانے والی تھی مگر اس وقت جو میں نے تیری گفتگو سُنی مجھ کو یقین ہو گیا کہ تجھ کو سمجھانا بے سود[۴] ہے۔ بڑا رنج تو مجھ کو اسی بات کا ہے کہ تو ہاتھ سے گیا گزرا ہوا۔ دوسرا کھٹکا یہ ہے کہ تو میرے لڑکوں کے پاس آتا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ تیری خُو بُو کا ایک شمّہ اُنھوں نے اختیار کیا تو میری طرف سے یہ جیتے جی مر گئے۔ ملنا جلنا تو بڑی بات ہے اب یہ محلّہ مجھ کو چھوڑنا پڑا۔ اتنی بے حیائی، ایسی بدزبانی۔ اوّل تو لڑنا اور پھر گلی کوچے میں اور اُس پر ایسی موٹی موٹی گالیاں"۔

میں۔ جناب خدا کی قسم، ہرگز میں نے پہل[۵] نہیں کی وہ سر پر چڑھ کر مجھ سے لڑا۔

حضرت بی۔ بس اپنی قسموں کو بند کرو۔ میں قسم اور گالی دونوں کو برابر سمجھتی ہوں۔ جس کو بے موقع بے محل خدا کا نام لینے میں باک[۶] نہیں۔ اُس کو کسی بات کے بک دینے میں تاٌمل نہیں۔

میں۔ گالی بھی پہلے اُس نے مجھ کو دی۔

---

[۱] غصّہ [۲] سر جھکائے [۳] عادت [۴] بے فائدہ [۵] شروع [۶] ڈر۔

حضرت بی۔ تم نے کیوں گالی کھانے کی بات کی؟
میں۔ یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا مطلق قصور نہ تھا۔
حضرت بی۔ کیا ایسے بیہودہ لڑکوں سے ملاقات رکھنا تمہارا قصور نہیں ہے؟
میں۔ جناب آپ کو معلوم نہیں وہ لڑکا راہ چلتوں کے سر ہوتا ہے۔
حضرت بی۔ یکے نہ شد دو شد۔ دروغ گویم بر روئے تو[1]
میرے لڑکوں کے تو کوئی بھی سر نہیں ہوتا؟
میں۔ ان سے تو سرے سے جان پہچان ہی نہیں۔
حضرت بی۔ اور تم سے ہے؟
میں۔ یہ کیونکر کہوں کہ نہیں ہے؟
حضرت بی۔ ہے۔ تو وہی تمہارا قصور ہے اور اسی کی یہ سزا ہے کہ تم نے بازار میں گالیاں کھائیں۔
میں۔ لیکن میں نے بھی خوب بدلا لیا۔
حضرت بی۔ بس یہی تو تمہاری خرابی کے لچھّن ہیں کہ اس کو تم بدلا سمجھتے ہو۔ اگر ایک شخص تمہارے ساتھ کچھ برائی کرے تو اُس کو لوگ بُرا کہیں گے یا نہیں کہیں گے؟
میں۔ ضرور کہیں گے؟

[1] ایک نہیں دو ہوئیں [2] میں تیرے مُنھ پر جھوٹ بولوں۔

حضرت بی۔ اور جب تم اُس کے ساتھ زیادہ بُرائی کرو تو کیا زیادہ بُرے نہ کہلاؤ گے؟ گالی بکنا ایک زبون بات ہے۔ اُس نے بکیں تو جھک مارا اور تم نے زیادہ بکیں تو زیادہ جھک مارا۔ سلیم تم اپنے میں اور اُس کنجڑے کے چھوکرے میں کچھ فرق سمجھتے ہو؟

یہ سُن کر مجھ کو ندامت شروع ہوئی اور میں نے کہا کہ واقع میں اُس وقت تو مجھ میں اور اُس میں کچھ فرق نہ تھا۔

حضرت بی۔ لیکن وہ ایک بازاری آدمی کا بیٹا ہے اور تم ایک بڑے عزّت دار کے لڑکے ہو۔ تمھارے دادا کا شہر میں وہ شہرہ ہے کہ اُن کے نام کی لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ اُنھیں کے پوتے تم ہو۔ جھوٹ بولنے پر دلیر۔ قسم کھانے میں بیباک۔ فحش بکنے میں بیدھڑک۔ سلیم کوئی شخص دین اور دُنیا دونوں میں اس وجہ سے عزّت نہیں پا سکتا کہ اُس کے باپ دادے عزّت دار تھے۔ آدمی کی عزّت اُس کی عادت اور مزاج سے ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں عزّت حاصل کرنے کی ہیں؟ ہرگز نہیں۔

یہ سُن کر مجھ کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں رونے لگا۔ اور حضرت بی بھی آبدیدہ ہوئیں اور مجھ کو پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہا کہ "بیٹا میں تمھارے ہی فائدے کے لئے کہتی ہوں۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ لیکن چند روز بعد تم کو ان عادتوں کا چھوڑنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

میں نے اُسی وقت توبہ کی اور کہا کہ " اگر اب سے آپ مجھ کو قسم کھاتے یا فحش بکتے یا جھوٹ بولتے یا بازاری لڑکوں میں کھیلتے سنیں تو مجھ کو اپنے گھر میں نہ آنے دیجئے گا۔

باپ۔ کیا بس اُسی دن سے تم کو کھیلنے سے نفرت ہو گئی؟

بیٹا۔ جناب نہیں، مہینوں میں حضرت بی کے یہاں جاتا رہا اور ہر روز نصیحت کی دو چار باتیں وہ مجھ کو بتایا کرتی تھیں۔ ایک روز اُنھوں نے مجھی سے میرے وقت کا حساب پوچھا، میں نے سونا اور کھانا اور کھیلنا اور تھوڑی دیر لکھنا پڑھنا بہتیرے کام گنوائے مگر اُنھون نے سُن کر ایک ایسی آہ کھینچی کہ آج تک اُس کی چوٹ میں اپنے دل میں پاتا ہوں اور کہا کہ "سلیم آٹھ پہر میں خدا کا ایک کام بھی نہیں؟ خدا نے تم کو آدمی بنایا۔ کیا ممکن نہ تھا کہ وہ تم کو بلّی یا کتّا بنا دیتا؟ پھر آدمی بھی بنایا تو ایسے خاندان کا جو عزّت دار اور خوش حال ہے۔ ہو سکتا تھا کہ تم مزدور یا لکڑ ہارے کے گھر پیدا ہوتے اور ایسی ہی چھوٹی سی عمر میں تم کو پیٹ پورا کرنے کے واسطے محنت کرنی پڑتی اور پھر بھی سوائے چبینے کے اور کچھ نہ پاتے اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ ایک لنگوٹی تم باندھے پھرتے نہ پانوں میں جوتی، نہ سر پہ ٹوپی، نہ گلے میں انگرکھا۔ جہاں جاتے دُور دُور، جس کے پاس کھڑے ہوتے پھٹ پھٹ۔ پھر صورت تم کو ایسی پاکیزہ دی کہ جو دیکھے پیار کرے۔ کیا تم کو کالا بھبٹ۔ کانڑا۔ لنگڑا۔ کوڑھی بنا دینا اس کو مشکل تھا؟

جس خدا کے تم پر اتنے سلوک اور اتنے احسان ہیں، ستم ہے، کہ دن رات میں ایک دفعہ بھی اُس کے آگے سر نہ جھکاؤ۔ غضب ہے کہ ایک لمحہ بھی اُس کو یاد نہ کرو) تب حضرت بی نے مجھ کو نماز سکھائی۔ اس کے معنی سمجھائے، اور اُسی طرح انھوں نے مجھ کو ہزارہا نصیحتیں کیں کہ برزبان یاد نہیں رہیں مگر افسوس ہے کہ کئی مہینے سے اُن کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا۔

یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

باپ۔ کیوں تم نے کس لئے اُن کے یہاں کا جانا ترک کیا؟ کیا اُن کے نواسوں سے لڑائی ہو گئی۔

بیٹا۔ جناب اُن کے نواسے مجھ کو بھائیوں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ اگر میں اُن سے لڑتا تو دُنیا میں مجھ سے زیادہ نالایق کوئی نہ تھا۔

باپ۔ پھر کیا خود حضرت بی تم سے ناخوش ہو گئیں؟

بیٹا۔ استغفراللہ وہ تو خود اس درجے کی نیک ہیں کہ غصّہ اُن کو چھو ہی نہیں گیا۔

باپ۔ تو کیا تم آپ سے آپ بیٹھ رہے؟

بیٹا۔ میں تو ہر روز وہاں جانے کے واسطے تڑپتا ہوں۔

باپ۔ تو کیا یہاں تم کو کسی نے منع کر دیا ہے؟

بیٹا۔ نہیں کسی نے منع بھی نہیں کیا۔

باپ۔ پھر کیا سبب ہوا؟

بیٹا۔ اگر آپ مجھ کو اس کا سبب بیان کرنے سے معاف رکھتے تو بہتر تھا۔

باپ۔ نہیں ضرور ہے کہ میں تمہارے نہ جانے کا سبب معلوم کروں۔

بیٹا۔ اس میں ایک شخص کی شکایت ہوگی اور حضرت بی نے مجھ کو غیبت اور چغلی کی ممانعت[1] کی ہے۔

باپ۔ لیکن کیا وہاں کے نہ جانے سے تمہارا نقصان نہیں ہے؟

بیٹا۔ اے جناب نقصان سا نقصان ہے مگر میرے اختیار کی بات نہیں۔

باپ۔ تو میں تم کو اپنے منصب پدری کی رُو سے حکم دیتا ہوں کہ تم سارا حال پوست[2] کندہ بیان کرو۔

بیٹا۔ جناب حضرت بی نے ایک مرتبہ مجھ کو بتاکید[3] کہا تھا کہ تم اپنے سر کے بال مُنڈا ڈالو۔ اگرچہ مجھ کو بال بہت عزیز تھے اور میں اُن کی خدمت بھی بہت کچھ کرتا تھا لیکن چونکہ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت بی جو بات کہتی ہیں ضرور میری منفعت[4] کے واسطے کہتی ہیں۔ میں نے کہا بہت خوب۔ حضرت بی نے اور تو کچھ سبب نہیں بیان کیا مگر اتنا کہا کہ بالوں کی بزرگ داشت میں تمہارا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے۔ اور وقت ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو ایسی فضول باتوں میں صرف

---

[1] منع کرنا [2] بالکل صاف اور سچ [3] ہدایت۔ اصرار [4] فائدہ۔ نفع۔

کیا جائے اور تم کو بڑے بال رکھنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگلے دن جو حجّام بڑے بھائی جان کا خط بنانے آیا۔ میں نے اُس سے کہا کہ خلیفہ میرے بال بھی مونڈ دینا۔ بالوں کا مونڈنا سُن کر بڑے بھائی جان اس قدر خفا ہوئے کہ میں عرض نہیں کرسکتا۔ مجھ کو جو چاہتے کہہ لیتے حضرت بی اور اُن کے نواسوں کو بہت ہی بُرا بھلا کہا۔ یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

باپ۔ تمھارے بڑے بھائی سے اور حضرت بی سے کیا واسطہ اور اُن کو تمھارے افعال میں میرے ہوتے کیا دخل؟

بیٹا۔ جناب نہیں معلوم اُن کو کس طرح معلوم ہوگیا تھا کہ میں اُن کے گھر آتا جاتا ہوں۔ دو ایک مرتبہ مجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ تو اُن مُردہ[1] شو قلاؤزیوں کے ساتھ اکثر رہتا ہے۔ کیا تو بھی مُلّانا اور مسجد کا ٹکڑ گدا[2] بنے گا؟ اُس دن بالوں پر کہنے لگے کہ دیکھا، آخر اُن نابکاروں[3] کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ آپ اچھے خاصے سر کو چھلا ہوا کسیرو بنانے چلے ہیں کہ دیکھتے ہی ہتھیلی کھجلائے، چانٹا مارنے کو جی چاہے۔ ابے اکیلے سر منڈانے سے کیا ہوتا ہے؟ گھٹنوں تک کا کرتہ پہن۔ ٹخنوں تک کا پائجامہ پہنا پنج آیت[4] کے واسطے دو چار سورتیں یاد کر اور جو چاہے کہ نقط اُنگلی کو خون لگا کر شہیدوں میں داخل۔ اور نرا سر منڈا کر بریانی کی دعوتوں میں

---

[1] مُردہ نہلانے والا [2] حقارت سے کہا [2] ٹکڑے مانگنے والا [3] ناکارہ [4] مردے کو ثواب پہنچانا۔

شامل ہو جاؤں تو بچا ہاتھ دھو رکھو۔ گھسنا تو ملنے ہی کا نہیں۔

باپ۔ تم نے کچھ جواب نہیں دیا؟

بیٹا۔ جناب اوّل تو بڑے بھائی کو جواب دینا خلاف شیوۂ ادب تھا اور اگر دیتا تو مجھ کو جیتا بھی نہ چھوڑتے۔ جب تک میں سامنے سے ٹل نہیں گیا اُنھوں نے زبان بند نہیں کی۔ اور ناحق حضرت بی اور اُن کے نواسوں کی شان میں بُری بُری باتیں کہیں۔ غرض ڈر کے مارے پھر میں نے بال مُنڈوانے کا نام نہیں لیا اور تب ہی سے مجھ کو ایک حجاب[1] سا پیدا ہوا کہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں، اپنے دل میں کیا کہتی ہوں گی کہ کیسا خود سر[2] لڑکا ہے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں بھول گئیں۔ یا کہنے سے کچھ فائدہ نہ دیکھ کر چپ ہو رہیں۔ ابھی تک میں نے جانا نہیں چھوڑا۔ اگرچہ میرا جانا داخل بے غیرتی تھا۔ جب انھوں نے مجھ کو نماز سکھائی اور نماز کی تاکید کی تو میں نے ایک دن گھر میں نماز پڑھنی چاہی۔ بڑے بھائی جان اور اُن کے یار دوست برابر ہنسائے جاتے تھے۔ اور نہیں ہنستا تھا تو جانماز اُلٹ اُلٹ دیتے سجدے میں جاتا تو اوپر بیٹھ بیٹھ جاتے تھے۔ ایسی حالت میں ممکن نہ تھا کہ میں نماز پڑھ سکوں اور حضرت بی سچ بولنے کا مجھ سے عہد لے ہی چکی تھیں۔ میں نے سوچا کہ جاؤں گا تو نماز کو پوچھیں گی۔ کیا کہوں گا؟ بالوں کی شرمندگی اور نماز کی ندامت۔ غرض اعمال کی

---

[1] مراد شرم [2] من موجی۔

شامت کہ میں نے جانا چھوڑ دیا۔ اب وہاں گئے مجھ کو تین ساڑھے تین مہینے ہو گئے۔ میری اس نااہلی[1] کو دیکھئے کہ تب ہی سے وہ میرے ہم جماعت بیمار پڑے ہیں۔ میں اُن کی عیادت[2] کو بھی نہیں جا سکا۔

باپ۔ لیکن تم نے اپنی مجبوری کا حال مجھ پر کیوں ظاہر نہیں کیا؟

بیٹا۔ اس خوف سے کہ فضیحت ہوگی۔

باپ۔ تم نے اپنے بڑے بھائی کے رُو در رُو[3] کہا ہوتا؟

بیٹا۔ اتنی مجال نہ مجھ میں کبھی تھی نہ اب ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں ہر وقت آپ کے پاس رہنے سے رہا۔ جب اکیلا پائیں گے مجھ کو ٹھیک بنائیں گے۔

باپ۔ تم کو خوف ہی خوف تھا۔ یا تم کو بڑے بھائی نے کبھی مارا بھی تھا؟

بیٹا۔ اس کی گنتی نہ میں بتا سکتا ہوں اور نہ بڑے بھائی جان بتا سکتے ہیں۔

باپ۔ کس بات پر؟

بیٹا۔ میں تو ہمیشہ اُن کے مارنے کو ناحق[4] بے سبب بے قصور بے خطا ہی سمجھا۔

باپ۔ تم نے اپنی ماں سے بھی کبھی تذکرہ نہ کیا؟

[1] نالائقی [2] بیمار کی مزاج پرسی [3] سامنے [4] غیر منصفانہ۔

بیٹا - جو وجہ آپ کی خدمت میں عرض کرنے کی مانع[1] تھی وہی والدہ سے کہنے کو بھی روکتی تھی - دوسرے میں دیکھتا تھا کہ گھر میں نماز روزے کا مطلق چرچا نہیں - یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہوں اور جس طرح بڑے بھائی جان ناخوش ہوتے ہیں اور لوگ بھی نا رضا مند ہوں -

باپ - تو یہ چند مہینے تمھارے نہایت ہی بُری طرح گزرے ؟

بیٹا - کچھ عرض نہیں کر سکتا - ایک حضرت بی کی خدمت سے محروم[2] رہنے کا صدمہ - دوسرے اپنی مجبوریوں کا رنج - میں نے لوگوں سے سُنا تھا کہ سگ[3] باش برادر خُرد مباش - سو مجھ کو ہر روز اُس کی تصدیق ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر تو اس بات کا قلق تھا کہ میں اپنے گھر میں سب چھوٹے بڑوں کی عادتوں کو ناپسند کرتا ہوں اور اپنے جی میں سوچا کرتا ہوں کہ جس گھر میں مجھ کو رہنا ہے اُس سے مجھ کو وحشت ہوتی ہے تو میں کہاں جاؤں گا اور کیا کروں گا ؟

باپ - لیکن اگر اب تم کو حضرت بی کے گھر جانا ملے ؟

بیٹا - سُبحان اللہ ، اس سے بڑھ کر کوئی خوشی کی بات نہیں لیکن جب تک کہ میں سر کے بال نہ منڈا لوں اور نماز نہ پڑھوں میں اُن کو مُنھ نہیں دکھا سکتا -

باپ - اور اگر یہ بھی ہو ؟

---

[1] روک - منع کرنے والی [2] باز - نا قابل [3] کتا بن جا چھوٹا بھائی نہ بن -

بیٹا - تو پھر یہ بھی ہو کہ ہمارے گھر بھر کی عادتیں وہیں کی سی ہو جائیں -

باپ - بھلا اگر یہ دونوں ہوں ؟

بیٹا - تو پھر مجھ کو اور کچھ درکار نہیں -

باپ - اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے اس تمام گھر پر ایک بربادی اور تباہی چھا رہی ہے اور سارا خاندان گناہ اور بے دینی کی آفت میں مبتلا ہے - آوے کا آوا خراب، کنبے کا کنبہ گمراہ - تعجب ہے کہ اب تک کوئی عذاب الٰہی ہم پر نازل نہیں ہوا - حیرت ہے کہ قہر خدا ہم پر کیوں نہیں ٹوٹ پڑا اور خدا کا الزام اور تم سب کا اُلاہنا تمام تر مجھ پر ہے - میں تم لوگوں کے جسموں کی پرداخت و پرورش کرتا رہا لیکن تمھاری روحوں کو میں نے ہلاک اور تمھاری جانوں کو میں نے تلف کیا - کتنے خون میری گردن پر ہیں اور کتنے وبال میرے سر پر ؏

بحیرتم[1] کہ سرانجام من چہ خواہد بود

سلیم آج تم خوش ہو کہ تمھاری آرزو بر آئی اور تمھارا مطلب خدا نے پورا کیا - شوق سے اپنا سر منڈاؤ اور نماز پڑھو اور حضرت بی کی خدمت میں جاؤ - آج سے حضرت بی میری دینی ماں اور اُن کے نواسے میرے دینی فرزند ہیں اور میں خود تمھارے ساتھ چلوں اور

[1] میں حیران ہوں کہ میرا انجام کیا ہوگا -

حضرت بی کا شکریہ ادا کروں گا کہ انھوں نے حسبۃً للہ[1] تمھارے اور
میرے دونوں کے ساتھ سلوک کیا۔ تمھارے ساتھ یہ کہ تم کو نیک صلاح
دی اور میرے ساتھ یہ کہ جو کام میرے کرنے کا تھا وہ انھوں نے کیا۔
آج کے بعد سے انشاء اللہ تم اس گھر کو حضرت بی کے گھر کی طرح
دیکھو گے کوئی تفرقہ تم میں اور اُن کے نواسوں میں باقی نہ رہے گا۔

سلیم! تمھاری آج کی گفتگو سُن کر میرا جی بہت ہی خوش ہوا اور تم
مجھ کو ساری اولاد میں سب سے زیادہ عزیز رہو گے۔ تم کو میں دوسروں
کے لئے نمونہ اور مثال بناؤں گا اور اُن کو جو تم سے بڑے ہیں تمھاری
تقلید[2] پر مجبور کروں گا۔

---

[1] اللہ واسطے [2] پیروی۔

05

فصل پنجم

فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ کی لڑائی

اِدھر تو نصوح اور سلیم دونوں باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اُدھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہو گئی۔ نعیمہ اُس وقت دُو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینے کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی کی چہیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، ماں باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہے کریلا اور نیم چڑھا اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ مُنہ کھلا اور مُنہ کا کھلنا تھا کہ سُسرال کا آنا جانا بند ہو گیا، اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی مگر رسّی جلی پر بل نہ گیا، باوجودیکہ اُجڑی ہوئی میکے میں پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا۔ کنوارپنے میں سوا گز کی زبان تھی کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا۔ سو بیاہے سے اُن کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹا جنے پیچھے تو اور بھی کھُل کھیلی۔ مردوں تک کا لحاظ اٹھا دیا۔

فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹیوں کا بیڑا اُٹھاتے تو اُٹھا لیا
تھا لیکن نعیمہ کے تصوّر سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو ہو جاتے تھے اور
جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی میں اُس بھڑوں کے چھتے کو
چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہیں کرے گی۔ سو سو منصوبے
ذہن میں باندھتی تھی مگر نعیمہ کی شکل نظر پڑی اور سب غلط ہو گئے
ماں تو موقع اور محل ہی سوچتی رہی۔ نعیمہ نے خود ہی ابتدا کی۔ بڑے
سویرے بچّہ حمیدہ کو دے کر خود ہاتھ منھ دھونے میں مصروف ہوئی
جب حمیدہ نے دیکھا کہ نماز کا وقت نکلا جاتا ہے بچے کو بٹھا نماز پڑھنے لگی۔
بچہ کس اکھل کھری ماں کا تھا۔ بٹھانا تھا کہ بلبلا اُٹھا، آواز سُن کر
ماں دوڑی آئی دیکھا کہ بچّہ اکیلا پڑا رو رہا ہے اور حمیدہ کھڑی نماز
پڑھ رہی ہے۔ دُور سے دَوڑ پیچھے سے حمیدہ کے ایسی دو ہتڑ ماری
کہ حمیدہ رکوع سے پہلے سجدے میں جا گری۔ اُس وقت فہمیدہ
کسی ضرورت سے دوسرے قطعے میں گئی تھی۔ پھر کر آئی تو دیکھا کہ
حمیدہ چبوترے پر پانی کا لوٹا لیئے ہوئے سر جھکائے بیٹھی ہے اور
ناک سے خون کی تلتلی جاری ہے۔ گھبرا کر پوچھا کہ ابھی تو میں تم کو
نماز پڑھتی چھوڑ گئی تھی اتنی ہی دیر میں یہ ہوا، تو کیا ہوا۔ دیکھوں کہیں
نکسیر تو نہیں پھوٹی۔

حمیدہ بیچاری نے ابھی کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ نعیمہ خود
بول اٹھی کہ "اے بی ہوا کیا۔ ذرا کی ذرا لڑکے کو دے کر میں منھ

دھونے چلی گئی اس نکمی سے اتنا نہ ہو سکا کہ ذرا لڑکے کو لئے رہے آخر میں کہیں کنوئیں میں گرنے تو نہیں چلی گئی تھی۔ لڑکے کو بلکتا ہوا لٹا نیت باندھ نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ میں جو آئی تو ذرا ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ آپ دھڑام سے گر پڑی۔ کہیں تخت کی کیل لگ لگا گئی ہو گی۔

ماں۔ اچھا تم نے ہولے سے ہاتھ رکھا تھا کہ نگوڑی لڑکی کے فصد کے برابر خون نکلا۔ کیسے دُنیا میں لہو سفید ہو گئے ہیں۔

نعیمہ۔ لہو سفید نہ ہو گئے ہوتے تو کیا یوں بھانجے کو روتا ہوا چھوڑ دیتی؟

ماں۔ لیکن اُس نے بے سبب نہیں چھوڑا۔ اُس کی نماز چلی جا رہی تھی۔

نعیمہ۔ بلا سے، صدقے سے، نماز کو جانے دیا ہوتا۔ نماز پیاری تھی یا بھانجا۔

ماں۔ لڑکی! ڈر خدا کے غضب سے۔ کیا کفر بک رہی ہے؟ اس حالت کو تو پہنچ چکی اور پھر بھی تو درست نہ ہوئی۔

نعیمہ۔ خدا نہ کرے میری کون سی حالت تم نے بُری دیکھی؟

ماں۔ اس سے بدتر حالت اور کیا ہو گی کہ تین برس بیاہ کو ہوئے اور ڈھنگ سے ایک دن اپنے گھر میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔

نعیمہ۔ وہ جنم جلا گھر ہی ایسا دیکھ کر دیا ہو تو کوئی کیا کرے؟

ماں۔ ہاں، بیٹی سچ ہے۔ میں تو تیری ایسی ہی دشمن تھی۔ مائیں بیٹیوں کو اسی واسطے بیاہا کرتی ہوں گی کہ بیٹیاں اُجڑی ہوئی اُن کے گھر گھٹنے لگی بیٹھی رہیں۔

نعیمہ۔ کیا جانیں ہم کو تو آنکھیں میچ کر کنویں میں ڈھکیل دیا تھا۔ سو پڑے ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔

ماں۔ خیر بیٹی اللہ رکھے تمھارے آگے بھی اولاد ہے اب تم سمجھ بوجھ کر اُن کی شادی بیاہ کرنا۔

نعیمہ۔ کریں ہی گے نہ کریں گے تو کیا تمھارے بھروسے بیٹھے رہیں گے۔

ماں۔ میں کیا کہتی ہوں کہ میرے بھروسے بیٹھی رہنا۔ بڑا بھروسا خدا کا۔

نعیمہ۔ کیسا خدا۔ بھروسا اپنے دم قدم کا۔

ماں۔ یہ دوسری دفعہ ہے کہ خدا کی شان میں بے ادبی کر چکی ہے۔ اب کی تو نے اس طرح کی بات منہ سے نکالی۔ اور بے تامل میں تڑ وسے سے طمانچہ تیرے مُنھ پر کھینچ ماروں گی۔

نعیمہ۔ سچ کہنا۔ بڑی بیچاری مارنے والیں۔ مارو اپنی چہیتی کو مارو اپنی لاڈو کو۔

ماں۔ کیسی چہیتی۔ کیسی لاڈو۔ قربان کی تھی وہ اولاد جو خدا کو نہ مانے۔

نعیمہ ۔ یہ کب سے ؟

ماں ۔ جب سے خدا نے ہدایت دی ۔

نعیمہ ۔ چلو، خیر جب ہم بھی تمھاری عمر کو پہنچیں گے تو بہتیرا خدا کا ادب کر لیں گے ۔

ماں ۔ آپ کو خیر سے غیب دانی میں بھی دخل ہے کہ بارے میری عمر تک پہنچنے کا یقین ہے ۔

نعیمہ ۔ اب تم میرے مرنے کی فال نکالو ۔

ماں ۔ نہ کوئی کسی کی فال سے مرتا اور نہ کوئی کسی کی فال سے جیتا ہے، جس کی جتنی خدا نے لکھ دی ۔

نعیمہ ۔ ورنہ تم مجھ کو کاہے کو جینے دیتیں ؟

ماں ۔ اتنا ہی اختیار رکھتی ہوتی تو تجھ کو آدمی ہی نہ بنا لیتی ۔

نعیمہ ۔ نوج، تو کیا میں حیوان ہوں ؟

ماں ۔ جو خدا کو نہیں جانتا ۔ وہ حیوان سے بدتر ہے ۔

نعیمہ ۔ اب تو ایک حمیدہ تمھارے نزدیک انسان ہے باقی سب گدھے ہیں ؟

ماں ۔ حمیدہ کا تجھ کو کیا جلاپا پڑ گیا ۔ تو اُس کی جوتی کی برابری تو کر لے ۔

نعیمہ ۔ خدا کی شان ۔ یہ اُٹھک بیٹھک کر لینے سے حمیدہ کو ایسے بھاگ لگ گئے ۔

فہمیدہ دو مرتبہ بیٹی کو منع کر ہی چکی تھی اور سمجھا دیا تھا کہ اگر پھر دین کی باتوں میں بے ادبانہ کلام کرے گی تو میں بے تامّل منھ پر طمانچہ کھینچ ماروں گی۔ اس مرتبہ جو نعیمہ نے نماز کو اُٹھک بیٹھک کہا تو حرارت دینداری نے فہمیدہ کو بے اختیار کیا اور اُس نے واقع میں جیسا کہا تھا نعیمہ کے منھ پر ایک طمانچہ ایسے زور سے مارا کہ مُنھ ہی تو پھر گیا۔ طمانچے کا لگنا تھا کہ نعیمہ نے ایک آفت توڑ ماری۔ سب سے پہلے تو اس نے دے دُھواں دھوں، دے دُھواں دھوں اپنے بے زبان معصوم بچّے کو پیٹ ڈالا۔ اگر لوگ اُس کی گود سے بچّے کو نہ چھین لیں تو وہ لڑکے کا خون ہی کر چکی تھی۔ اُس کے بعد تو اُس نے عجب عجب فیل[1] مچائے گھٹنوں تک تو ٹخنیاں کھا یا کی۔ کپڑوں کا ایک تار باقی نہ رکھّا۔ نہیں معلوم اُس کا سر تھا یا لوہے کا گولہ تھا کہ ہزاروں تو دو ہتّڑیں اُس پر پڑیں۔ آدھے سے زیادہ بال کھسوٹ ڈالے سیکڑوں ٹکریں دیواروں میں ماریں۔ حیرت ہے کہ وہ سر بچا تو کیونکر بچا۔ اُس کے پاکھنڈ دیکھ کر سارا گھر تھرّا اُٹھا اور لوگ ڈرنے لگے کہ ایسا نہ ہو، تھانے والے غل سُن کر اندر گھس آئیں، بارے بمشکل پکڑ دھکڑ کر کوٹھری کے اندر ڈھکیل اوپر سے کُنڈی لگا دی۔ نیچے گھر میں اتنا غل ہوا مگر بالا خانہ کچھ ایسا الگ سا تھا کہ نصوح کو مطلق خبر نہیں ہوئی۔ جب سلیم باپ سے باتیں کر کے

[1] فیل۔ مکر

نیچے اُتر آیا تو فہمیدہ اوپر گئی - اُس وقت تک غیظ و غضب اور رنج و تعب کے آثار اُس کے چہرے سے نمودار تھے - دُور ہی سے نصوح نے پوچھا "خیریت تو ہے"؟

فہمیدہ - اللہ تعالیٰ خیریت ہی رکھے" - کیوں تم نے کیا سمجھ کر پوچھا؟

نصوح - تمھارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں - ہونٹھ خشک ہو رہے ہیں، سر سے پاؤں تک کھڑی کانپ رہی ہو آخر یہ سب باتیں بے سبب تو نہیں ہیں؟

فہمیدہ نے نعیمہ کی اور اپنی تمام سرگزشت بیان کی - نصوح یہ ماجرا سُن کر دم بخود ہو گیا - آدھے گھنٹے کے قریب دونوں میاں بی بی چپ سناٹے میں بیٹھے

آخر فہمیدہ نے کہا پھر اب کیا صلاح ہے؟

نصوح - صلاح یہی ہے کہ جو ہونی ہو سو ہو، اب نرمی اور لینت نہیں کرنی چاہیئے - معاذ اللہ ایسا بُرا عقیدہ بھلا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی اسلام کے خاندان کی لڑکی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ خدا اُس کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں - مجھ کو تو اس کے ساتھ کھانا حرام ہے - بڑی خیریت گزری کہ میں وہاں موجود نہ تھا - ورنہ میرے روبرو ایسا کلمہ اُس کے مُنھ سے نکلا ہوتا تو شاید میں تلوار کھینچ مارتا - ایسی اولاد کے ہونے سے نہ ہونا اچھا، بہتر ہو گا کہ

ابھی پالکی منگا اُس کو اُس کی سُسرال پہنچا دو۔

فہمیدہ - بھلا کیسی باتیں کہتے ہو؟ بے طلب بے تقریب بھیجدیں تو ایک تو پہلے ہی سے اس نے اپنی عزّت کو خاک میں ملا رکھا ہے۔ رہی سہی اور بھی غارت ہو۔ مجھ کو کیا خبر تھی، ورنہ تمھاری عیادت کی تقریب سے عورت مرد سارا سمدھیانہ آیا تھا اور اُس کے لے جانے کے لئے منتیں کرتے تھے۔

نصوح - جو کمبخت عورت خُدا کی عزّت و حُرمت نہ رکھے وہ دنیا میں ہر طرح کی بے عزّتی اور بے حُرمتی کی سزاوار ہے جب اُس کو خدا کا پاس ادب نہیں مجھ کو ہرگز ہرگز اُس کا پاس محبت نہیں۔

فہمیدہ - میں کہتی ہوں شاید اب بھی یہ درست ہو جائے۔

نصوح - توبہ توبہ، اُس کے دل میں مطلق نورِ ایمان نہیں۔ وہ سرے سے خدا ہی کی قائل نہیں۔ پھر کیا درستی کی اُمید؟

فہمیدہ - سُسرال بھیجدینا تو ٹھیک نہیں۔

نصوح - پھر مجھ سے کیا صلاح پوچھتی ہو؟ جو تمھارے جی میں آئے سو کرو لیکن یہ ممکن نہیں کہ اُس کے یہ خیالات ہوں اور میں اُس کو اپنے گھر میں رہنے دوں اور وہ رزق جو ہم کو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی اور عنایت سے دیتا ہے وہ شخص اس میں کیوں شریک ہو جو خدا ہی کو نہیں مانتا؟

فہمیدہ - لیکن خدائے تعالیٰ اپنا رزق کسی سے دریغ نہیں رکھتا

بُرے بھلے سب اُس کے یہاں سے روزی پاتے ہیں۔

نصوح۔ میں اُس کے رزق کا انسداد نہیں کرتا لیکن میں اپنے رزق میں منکر خدا کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔

فہمیدہ۔ ایسی سختی سے گھر میں کوئی کاہے کو رہنے لگا؟

نصوح۔ میں اُس گھر کی فکر میں ہوں جہاں مجھ کو ہمیشہ رہنا ہے۔ دُنیا کا گھر چند روزہ گھر ہے۔ آج اُجڑا تو اور کل اُجڑا تو۔ ایک نہ ایک دن اجڑے گا ضرور۔ کیا میرے آباد کرنے سے آباد رہ سکتا ہے؟

فہمیدہ۔ ہاں۔ لیکن ایک مرے پیچھے اُجڑنا اور ایک جیتے جی اجڑنا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

نصوح۔ لیکن تم دل کی ایسی کچی تھیں تو تم نے ہامی[1] کیوں بھری اور تمہارا یہ حال ہے تو واقع میں خاندان کی اصلاح ہو نہیں سکتی؟

فہمیدہ۔ کیا اولاد کے واسطے جی نہیں کڑھتا؟ میں نے اُن کو اسی دن کے واسطے پالا تھا کہ یہ بڑے ہو کر مجھ سے چھوٹ جائیں؟ بیشک مجھ سے تو اتنا صبر نہیں ہو سکتا۔

اتنا کہہ کر فہمیدہ کا جی بھر آیا اور وہ رونے لگی

نصوح۔ میں نہیں کہتا کہ تمہارا جی نہیں کڑھتا۔ اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ مجھ کو تمہارے برابر ان کی محبت ہے لیکن میں نے

[1] ہاں کہنا۔ اقرار کر لینا۔

یہ بھی تو نہیں کہا کہ تم ان کو چھوڑ دو۔

فہمیدہ ۔ کیوں ابھی تم نے نعیمہ کو سسرال بھیج دینے کے لئے نہیں کہا؟

نصوح ۔ کیا نعیمہ کبھی سسرال نہیں گئی اور سسرال بھیج دینا اور چھوڑ دینا ایک ہی بات ہے؟

فہمیدہ ۔ لیکن ایک ہنسی خوشی جانا، جس طرح دُنیا جہان کی بیٹیاں میکے سے جایا کرتی ہیں اور ایک لڑ کر جانا اور لڑائی بھی ایسی لڑائی کہ عمر بھر ایسی نہیں ہوئی۔ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے نعیمہ کو کبھی ہاتھ بھی لگایا ہو۔ جواب اس سے زیادہ سخت اُس نے دیے مگر جب وہ جواب دیتی تھی میں ہنس دیا کرتی تھی۔ اس مرتبہ نہیں معلوم میں کچھ ایسی آپے سے باہر ہو گئی کہ تھپڑ کھینچ مارا۔ اتنا بھی مجھ کو خیال نہ رہا کہ یہ بیاہی ہوئی ہے، صاحبِ اَولاد ہے۔

نصوح ۔ اگر تم نے اُس کو تھپڑ نہ مارا ہوتا تو میں تم سے پوچھتا کہ تم کیسی دیندار تھیں کہ ایک شخص نے جس کے دفع کرنے پر تم کو قدرت حاصل تھی۔ تمھارے مُنھ پر خدا کی شان میں بے ادبی کی استخفاف[1] و استہزا[2] کے ساتھ اس کا نام پاک لیا۔ اور مطلق تم کو بُرا نہ لگا۔

فہمیدہ ۔ بُرا نہ لگتا تو میں مارتی ہی کیوں؟

نصوح ۔ بیشک تم نے مارا، تو بہت بجا کیا، لیکن اب اُس پر

---

[1] خفیف کرنا [2] مذاق اڑانا۔

افسوس کرنا اپنے تئیں ملزم بنانا ہے۔

فہمیدہ ۔ لیکن لڑکی جو ہاتھ سے جاتی ہے؟

نصوح ۔ یہ حالت تمھارے لئے ایک امتحان کی حالت ہے ایمان اور اولاد دو چیزیں ہیں اور سخت افسوس کی بات ہے کہ ان دونوں کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اس واسطے کہ ہماری اولاد دین کی عدو اور ایمان کی دشمن ہے۔ اگر اولاد کا منھ کریں تو دین و ایمان ہاتھ سے جاتا ہے اور اگر ایمان کا حفظ کریں تو اولاد چھوٹتی ہے پس تم کو اختیار ہے۔ دونوں میں سے جس کو چاہو لو۔

فہمیدہ ۔ میں ایمان لوں گی۔ میں ایمان لوں گی۔ جو عاقبت میں میرے کام آئے گا۔

نصوح ۔ جزاک اللہ[1]، صد آفریں ہے تمھاری فہم پر بیشک ایمان بڑی چیز ہے۔

فہمیدہ ۔ رہی اولاد، کیا کروں، چھاتی پر پتھر رکھوں گی۔ مجھ کو کیا خبر تھی کہ اس پیٹ کمبخت کو یوں آگ لگے گی اور اس ناشاد کوکھ میں ایسے کیڑے پڑیں گے۔

فہمیدہ یہ کہہ کر بڑے درد و حسرت کے ساتھ روئی کہ اُس کو دیکھ کر نصوح بھی بیقرار ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نصوح بولا کہ " دل کو مضبوط رکھو اور اللہ کو یاد کرو۔ جب تمھاری نیت بخیر ہے تو سب

---

[1] خدا تمھیں بدلا دے۔

انشاء اللہ بہتر ہی بہتر ہوگا وہ بڑا قادر ہے۔ چاہے تو دم کے دم میں ہماری ساری اولاد کو ولی کر دے۔ دعا کرو کہ اللہ اُن کو نیک راہ دکھائے۔

فہمیدہ۔ رُواں رُواں دعا کر رہا ہے۔ اللہ قبول کرے اور اُسی سے لَو لگی ہے۔

نصوح۔ بھلا نعیمہ کوٹھری کے اندر کیا کر رہی تھی؟

فہمیدہ۔ رو رہی تھی اور کیا کر رہی تھی۔ میں چلتے ہوئے کہتی آئی تھی کہ کواڑ کھول کر اُس کو پانی وانی پلا دینا۔

نصوح۔ اور کھانا؟

فہمیدہ۔ کیا خوب! نہ ابھی دو دن نہ چار دن ابھی سے کھانا؟

نصوح۔ یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے۔

فہمیدہ۔ اور کیا بڑا رونا تو کھانے ہی کا ہے وہ مجھ سے چاہے مہینوں نہ بولتی مگر کھانا کھا لیتی تو کچھ اندیشے کی بات نہ تھی، اُدھر اُس کو تکلیف ہوگی ادھر بچہ دودھ کو پھڑکے گا۔

نصوح۔ تم اپنا دودھ پلا دینا

فہمیدہ۔ میں تو اُس کو سو دفعہ پلاؤں مگر اللہ رکھے سیانا بچہ ہے۔ ماں کی گود پہچانتا ہے۔ کہتے ہیں کہ چالیس دن کا بچہ ماں کی پرچھائیں دیکھنے لگتا ہے۔ اب تو سوتے کو ایک دفعہ میں پلا آئی ہوں جاگتے میں پئے تو میں جانوں کہ پیا۔

نصوح - کھانا کھانے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے - میں جا کر کہوں؟

فہمیدہ - نہ خدا کے لئے تم اُترنا ہی مت -

نصوح - میں آہستگی سے سمجھا دوں گا -

فہمیدہ - مَردوں کی آہستگی کا کچھ اعتبار نہیں اور پھر تمھاری آہستگی کہ ابھی باتوں ہی باتوں میں تم تلوار کھینچنے لگے تھے -

نصوح - میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ کسی طرح کی سختی نہیں کروں گا -

فہمیدہ - پھر بھی کیا ہوا؟ تمھارا دخل دینا مناسب نہیں، آخر ایک آدمی گھر میں ایسا بھی ہونا چاہیے کہ چھوٹے بڑے سب اس کا لحاظ کریں اور فرض کیا کہ تم گئے اور رنج اُس کا تازہ ہے اُس نے نہ مانا تو پھر بڑی دشواری پڑے گی اور اُس کو یہ شرم دامنگیر ہو گی کہ دیکھو باپ تک مجھ کو سمجھا کر ہار گئے اور میں نے کسی کا کہنا نہ مانا - اب جو من جاؤں گی تو باپ، جی میں کیا کہیں گے؟

نصوح - اچھا تو ایک تدبیر کرو اس کی سہیلیوں میں سے کوئی سمجھدار ہے؟ اس کو بلا بھیجو - وہ سمجھا بجھا کر راضی کر لے گی -

فہمیدہ - ہاں یہ ایک معقول تدبیر ہے - میں اپنی بھانجی صالحہ کو بُلاتی ہوں - دونوں ہمعمر ہیں اور دونوں کی ملی بھگت بھی ہے -

نصوح - بس تمھارے انتخاب پر میرا صاد ہے - تمھاری بہن کے گھر نماز روزے کا بھی خوب چرچا رہا کرتا ہے - جمعہ کے جمعہ وعظ

ہماری بہن کے دل میں کبھی ایسا خیال ہی نہیں آیا اگر مجھ پر اُن کو حسد ہوتا تو موقع تھا لیکن میرے اور میرے بچّوں کے زیور اور کپڑے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی ہیں اور ہر چیز پر کہے جاتی ہیں، ماشاء اللہ، چشم بد دُور، اللہ زیادہ دے، اللہ نصیب کرے۔ بچّے ہیں کہ دُنیا کی نعمت اُن کے سامنے رکھ دو۔ آنکھ اُٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتے۔

نصوح۔ سچ ہے الغناء غنی[1] النفس۔ تو انگری بدل است نہ بمال، دُنیا کے مال و حشمت کی ان کی نظروں میں وقعت ہی نہیں تو پھر حسد کیوں کریں۔

فہمیدہ۔ اور مجھ سے اور میرے بچّوں سے اس قدر محبت کرتی ہیں کہ ڈولی سے اُترتی ہیں تو اوپر تلے بلائیں لئے چلی جاتی ہیں بلکہ مجھ کو اُن کے بچّوں سے ذرا بھی اُنس نہیں۔

نصوح۔ اُن کی یہ محبت و ہمدردی، خدا پرستی کی وجہ سے ہے اور کچھ تمھاری تخصیص نہیں۔ سب کے ساتھ اُن کی یہی کیفیت ہو گی۔

فہمیدہ۔ بچّوں کو کچھ ایسا سُدھار رکھا ہے کہ کبھی آپس میں لڑتے ہی نہیں۔ ایک ہمارے بچّے ہیں کہ ایک دم کو ایک کی ایک سے نہیں بنتی۔

نصوح۔ یہ اُن کی تعلیم و تلقین[2] کا نتیجہ اور اُن کے اپنے عمدہ نمونہ کا اثر ہے۔ مگر تم اُن کو اکثر مہمان بُلا کر اپنے یہاں رکھا کرو کہ

[1] مالداری دل ہی سے ہوتی ہے۔ دل غنی ہے تو آدمی غنی ہے [2] سکھانا۔

ہوتا ہے۔ صالحہ کے خیالات ضرور دیندارانہ خیالات ہوں گے۔

فہمیدہ۔ اللہ اکبر! اُن کے گھر کی دینداری ضرب المثل[1] ہے، ہماری بہن، اللہ رکھے اتنی بڑی نمازن ہیں کہ انھوں نے اپنے ہوش میں تو کسی وقت کی نماز قضا کی نہیں۔ اتنا تو بال بچوں کا بکھیڑا اُن کے ساتھ ہے اور خدا کی مرضی گھر میں سدا تنگی رہتی ہے۔ سب کام کاج بیچاری کو اپنے ہی ہاتھوں سے کرنا پڑتا ہے لیکن پنج وقتی نماز اور فمی بشوق کی منزل کیا امکان کہ قضا ہو۔

نصوح۔ سبحان اللہ، وہی لوگ بڑے خوش قسمت ہیں، دُنیا کے نقیر دین کے امیر۔

فہمیدہ۔ اور لطف یہ کہ ہر وقت ہشاش بشاش، کبھی عُسرت کی شکایت یا تنگدستی کا گلہ کرتے ہم نے تو اُن کو سُنا نہیں اور چھوٹے بڑے سب مستغنی اور سیر چشم۔ ہم کو اتنا تو خدا نے دے رکھا ہے لیکن میں سچ کہتی ہوں کہیں شادی بیاہ میں کسی بیوی کو اپنے سے بہتر زیور یا کپڑا پہنے دیکھتی ہوں تو ضرور میرا جی بہت کڑھتا ہے اور بچوں کا بھی یہی حال ہے کوئی چیز کسی کے پاس ذرا دیکھ پائیں، جب تک ویسی ہی موجود نہ ہو جائے، میری جان کھا جائیں۔ لیکن

[1] کہاوت۔ مشہور۔ ف سے سورۂ فاتحہ، م سے سورۂ مائدہ، ی سے سورۂ یونس، ب سے سورۂ بنی اسرائیل، ش سے سورۂ شعراء، و سے سورۂ والصافات، ق سے سورۂ ق، یوں ہفتہ بھر میں قرآن شریف ختم کرنا۔

ہمارے گھر پر بھی اُن کا پڑتو پڑے۔

فہمیدہ۔ ہماری بہن غیرت مند بڑی ہیں۔ میں نے کئی بار اُن سے کہا تو یہی جواب دیا کہ میرے ساتھ بکھیڑا بہت ہے تمھاری سسرال والے نہیں معلوم دل میں کیا سمجھیں، کیا کہیں؟ اس سے میرا آنا نہیں ہو سکتا۔ خدا کرے کہ تم بیٹے بیٹیوں کی شادیاں کرو۔ بیاہ کرو۔ تو دیکھو بے بُلائے پہنچتی ہوں یا نہیں؟

نصوح۔ کوئی سامان ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُن کو فکرِ معاش سے فارغ البالی ہو؟

فہمیدہ۔ وہ ہمارے بہنوئی صاحب کچھ اس کی پیروی ہی نہیں کرتے۔ اُن کا مقولہ ہے کہ جتنا ہم کو اب ملتا ہے بس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔

نصوح۔ گھر میں تکلیف رہا کرتی ہوگی؟

فہمیدہ۔ تکلیف تو ہونی ہی چاہیئے۔ بیس روپیہ مہینے کی نوکری اور ہمارے بہنوئی کی سی احتیاط۔ اللہ رکھے اتنا بڑا کنبہ مگر جیسا میں نے تم سے کہا جب سُنا اُن کو شکر گزاری ہی کرتے سُنا، اور کچھ خدا نے برکت بھی ایسی دی ہے کپڑا لتّا گہنا پاتا، سامان ظاہر حیثیت کے موافق کچھ بُرا نہیں۔ کسی کے قرضدار نہیں۔ تیوتا بیوہار کے ایسے کھرے کہ اگر کسی نے ان کے گھر ایک روپیہ دیا ہوگا، تو

ل سایہ

انھوں نے دو ضرور دیے ہوں گے۔ غرض کنبے اور برادری میں بھی کسی سے شرمندہ نہیں۔

نصوح۔ بڑی ہی اچھی زندگی ہے۔

فہمیدہ۔ اس میں شک نہیں۔ کیسی ہی مصیبت ہو میں نے اُن کو مضطر اور بیقرار نہیں دیکھا۔ ہر بات میں اللہ پر توکّل۔ خدا پر بھروسا۔

نصوح۔ مجھ کو حیرت ہے کہ تم دونوں سگی بہن اور عادتوں میں اتنا تفاوت؟

فہمیدہ۔ ماں کے گھر تک تو میرا بھی یہی حال تھا۔ اُنھوں نے ہم دونوں کو یکساں سکھایا۔ برابر پڑھایا۔ مگر برا مت ماننا۔ جب میں تمھارے پلّے بندھی تمھارے گھر میں آکر جو دیکھا تو دین کا کچھ تذکرہ نہ پایا۔ رفتہ رفتہ نماز وغیرہ کی سب عادتیں چھوٹ گئیں۔ ہماری ماں اللہ جنّت نصیب کرے بڑی ہی دیندار تھیں۔ جب دُلھن کو رخصت کرتے ہیں تو دستور ہے کہ بیٹی کی ماں۔ بیٹے کی ماں سے کہا کرتی ہے کہ میں تمھاری خدمت کو یہ لونڈی دیتی ہوں۔ ہماری ماں نے مجھ کو اب تک یاد ہے رخصت کرتے وقت امّاں جان[1] سے یہ کہا تھا کہ "دیکھو بُوا میری لڑکی نے آج تک نماز قضا نہیں کی اب میں اس کو تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ اتنا خیال رکھنا کہ اس کی نماز قضا نہ ہو ورنہ میں بری الذمہ ہوں۔ اس کا وبال اس پر ہوگا یا تمھاری گردن پر"

[1] نصوح کی ماں اور فہمیدہ کی ساس مراد ہے۔

جب میں نئی نئی بیاہ کر آئی تو شرم کے مارے اٹھتی میں نہ تھی، چلتی پھرتی میں نہ تھی، تمام کنبے کی عورتیں ایک دم کو مجھ سے الگ نہ ہوتی تھیں کہ میں تنہائی پا کر دو رکعت نماز پڑھ لیتی اور باوجودیکہ میری ماں نے چلتے چلتے اماں جان سے کہہ دیا تھا مگر اُنھوں نے بھی کچھ خیال نہ کیا۔ بس اسی دن سے میری نماز جانی شروع ہوئی۔ دو چار دن تو دل کو افسوس رہا۔ ہوتے ہوتے عادت چھوٹ گئی اور ایسی شامت کی مار آئی کہ پھر مجھ کو نماز نہ پڑھنے کا رنج بھی نہیں ہوتا تھا۔ غرض دُنیا کی چند روزہ شرم نے مجھ کو پکی بے دین بنا دیا۔ اور میری وہی کہاوت ہوئی کہ "جس نے کی شرم اُس کے پھوٹے کرم"۔ لیکن چونکہ نماز کی خوبی بچپن سے ذہن میں بیٹھ چکی تھی اب بھی اتنا تھا کہ جس دن سر دھویا دو چار وقت کی نماز ضرور پڑھ لیا کرتی تھی۔ یا کوئی بال بچہ بیمار ہوا تو نماز پڑھنے لگی۔ جب خدا نے اس تردّد کو دفع کر دیا پھر چھوڑ دی اب البتہ میں نے مصمم عہد کر لیا ہے کہ برابر نماز پڑھوں گی۔ خدا میرے قول کو پورا کرے۔

نصوح ۔ آمین ثم آمین۔

اس کے بعد فہمیدہ نے نیچے اُتر کر فوراً صالحہ کے واسطے ڈولی بھیجی اور لونڈیوں سے کہہ دیا کہ کہار سواری لے کر آئیں تو چپکے سے پہلے مجھ کو خبر دینا۔

06

فصل ششم

نصوح اور منجھلے بیٹے علیم کی گفتگو

نصوح نے نماز عصر سے فارغ ہو کر منجھلے بیٹے علیم کو پچھوایا کہ دیکھو مدرسے سے آئے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ ابھی آئے ہیں اور کپڑے اُتار رہے ہیں تو کہلا بھیجا کہ اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر ذرا کی ذرا میرے پاس ہو جائیں۔ تھوڑی دیر میں علیم مدرسے کا لباس اُتار کتابیں ٹھکانے سے رکھ۔ باپ کی خدمت میں جا حاضر ہوا دیکھتے ہی باپ نے کہا، "آؤ صاحب۔ آج کل تو میں نے سنا ہے تم کو بہت ہی محنت کرنی پڑتی ہے۔

بیٹا۔ امتحان ششماہی قریب ہے اُسی کے واسطے کچھ تیاری کر رہا ہوں۔ دن تھوڑے سے رہ گئے اور کتابیں دیکھنے کو بہت باقی ہیں۔ ہر چند ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو گھر پر کتاب دیکھا کروں مگر نہیں بن پڑتا۔ لوگ جو بھائی جان کے پاس آکر بیٹھتے ہیں ایسی ادھم مچاتے ہیں کہ طبیعت اچاٹ ہوئی چلی جاتی ہے؟

باپ۔ پھر تم کچھ اس کا انسداد نہیں کرتے؟

بیٹا۔ اس کا انسداد میرے اختیار سے خارج ہے۔ اور رات رائگاں جاتی ہے۔ دن کو البتہ میں نے مکان کا رہنا ہی چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی اور اپنے کسی ہم جماعت کے یہاں چلا گیا۔

باپ۔ اور بڑے امتحان کے واسطے بھی تم کچھ تیاری کر رہے ہو؟

بیٹا۔ ابھی اُس کے بہت دن پڑے ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر دیکھا جائے گا۔

باپ۔ کیا اُس کا کوئی وقت مقرر ہے؟

بیٹا۔ جناب ہاں۔ بڑے دن کی تعطیل کے قریب ہوا کرتا ہے۔

باپ۔ نہیں نہیں! تم نے میری مُراد کو نہیں سمجھا۔ میں حساب آخرت کو بڑا امتحان کہتا ہوں۔ کیا وہ بڑا امتحان نہیں ہے؟

بیٹا۔ کیوں نہیں۔ سچ پوچھئے تو سب سے بڑا سخت امتحان وہی ہے۔

باپ۔ تو میں جب تمہارے ان دُنیوی چھوٹے چھوٹے امتحانوں کی خبر رکھتا ہوں تو کیا اُس بڑے سخت امتحان کی نسبت میں نے تم سے پوچھا تو کچھ بیجا کیا؟

بیٹا۔ جناب! میں تو نہیں کہتا کہ آپ نے بیجا کیا۔ ایسا کہنا میرے نزدیک گستاخی اور گناہ دونوں ہے۔

باپ۔ اچھّا تو میں سُننا چاہتا ہوں کہ تم اُس بڑے سخت امتحان کے واسطے کیا تیاری کر رہے ہو؟

بیٹا۔ جناب! سچ تو یہ ہے کہ میں نے اُس امتحان کے واسطے مطلق تیاری نہیں کی۔

باپ۔ کیا یہ غفلت نہیں ہے؟

بیٹا۔ جناب! غفلت بھی پرلے درجے کی غفلت ہے۔

باپ۔ لیکن جب تم ایسے دانشمند ہو کہ دُنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لئے مہینوں اور برسوں پہلے سے تیاری کرتے ہو تو اُس سخت امتحان سے غافل رہنا بڑے تعجب کی بات ہے؟

بیٹا۔ شامتِ نفس۔

باپ۔ لیکن تمہاری غفلت کا کچھ اور بھی سبب ضرور ہوگا؟

بیٹا۔ سبب یہی ہے۔ میری سہل[1] انکاری۔

باپ۔ تم جواب دیتے ہو لیکن صرف لفظوں کو پھیر پھار کر۔ میں تم سے غفلت کا سبب پوچھتا ہوں اور تم نے کہا کہ سہل انکاری اور سہل انکاری اور غفلت ایک چیز ہے تو گویا تم نے غفلت کو غفلت کا سبب کہا۔

بیٹا۔ شاید گھر میں دینداری کا چرچا نہ ہونے سے میری غفلت کو ترقی ہوئی ہو

باپ۔ بیشک یہی سبب ہے تمہاری غفلت کا اور میں نے تم سے کھود کھود کر اسی لئے دریافت کیا کہ جہاں تک تمہاری غفلت

---

[1] معمولی بات سمجھنا۔ سُستی

میری بے پروائی کی وجہ سے ہے۔ اس کا الزام مجھ پر ہے اور ضرور ہے کہ میں تمھارے روبرو اُس کا اقرار کروں اور تم چھوٹے ہو کر مجھ کو ملامت کرو۔

بیٹا۔ نہیں، جناب! قصور سراسر میرا ہے۔ مجھ کو خدا نے اتنی موٹی بات کے سمجھنے کی عقل دی تھی کہ مجھ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور میرے پیدا کرنے سے صرف یہی غرض نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ میں جانوروں کی طرح کھانے اور پانی سے اپنا پیٹ بھر کر سورہا کروں،

باپ۔ تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری دینی معلومات بھی کم درجے کی نہیں ہے لیکن نہ تو دین کے مسائل میں نے تم کو خود سکھائے، نہ اُن کے سیکھنے کی کبھی تاکید کی۔ مدرسے میں تاریخ، جغرافیہ و ہندسہ و ریاضی کے سوائے کوئی دوسری چیز پڑھاتے نہیں پھر دینی معلومات حاصل کی تو کہاں سے کی؟

بیٹا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا لیکن وہ دوسرے مُلک کی زبان ہے۔ طوطے کی طرح اول سے آخر تک پڑھ گیا۔ مطلق سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور کیا اس کا مطلب ہے۔ پھر مکتب میں گیا تو وہاں بھی کوئی دین کی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا، قصے کہانی اُن میں بھی اکثر بُری بُری باتیں، یہاں تک کہ جن دنوں میں "بہار دانش" پڑھتا تھا ایک پادری صاحب "چاندنی چوک" میں سربازار وعظ کہا کرتے تھے۔

مکتب سے آتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ پادری صاحب کے ساتھ کتابوں کا بھی ایک بڑا بھاری ذخیرہ رہتا تھا۔ اور اکثر لوگوں کو اُس میں سے کتابیں دیا کرتے تھے۔ ہمارے مکتب کے کئی لڑکے بھی کتابیں لائے تھے انھوں نے کتاب کی جلد تو اُکھاڑلی اور ورقوں کو یا تو پھاڑ کر پھینک دیا یا پٹھے بنائے کتابوں کی عمدہ عمدہ جلدیں دیکھ کر مجھ کو بھی لالچ آیا۔ اور میں نے کہا چلو ہم بھی پادری صاحب سے کتاب مانگیں۔ مکتب سے اُٹھ میں سیدھا پادری صاحب کے پاس چلا گیا۔ بہت سے لوگ اُن کو گھیرے ہوئے تھے۔ اُن میں ہمارے مکتب کے دو چار لڑکے تھے۔ لوگ اُن کے ساتھ کچھ مذہبی بحث کر رہے تھے اُس کو میں نے خوب نہیں سمجھا، مگر ایک بات تھی کہ اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو مسلمان سیکڑوں آدمی ایک طرف۔ لوگ ان کو بہت سخت سخت باتیں بھی کہتے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور لڑ پڑتا۔ مگر پادری صاحب کی پیشانی پر چین[1] بھی تو نہیں آتی تھی۔ سخت بات سُن کر الٹے مسکرا دیتے تھے۔ لڑکے ایک شیطان ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کھڑے سنتے رہے۔ چلنے لگے تو اُن میں سے ایک نے کہا "لُولُو ہے بے لُولُو ہے" اُس کی یہ بات سب لوگوں کو ناگوار ہوئی اور دو چار آدمیوں نے اُس کو مارنے کے لئے تھپڑ بھی اٹھائے۔ پادری صاحب نے روکا اور منع کیا

---

[1] شکن۔

کہ خبردار اس سے کچھ مت بولو۔ لُولُو موتی کو بھی کہتے ہیں۔ شاید اُس نے یہ سمجھ کر کہا ہو تو اُس کو انعام دینا چاہیئے۔ پادری صاحب کی اس بات نے مجھ پر کیا شاید سب لوگوں کے دل پر بڑا ہی اثر کیا اور جب شام ہوئی۔ لوگ رخصت ہوئے تو کئی آدمی آپس میں کہتے جاتے تھے کہ بھائی اس شخص کا عقیدہ چاہے کیسا ہی ہو لیکن حلم[1] اور بُردباری یہ صفت اس میں اولیاء اللہ کی سی ہے غرض پادری صاحب تو وعظ میں مصروف تھے اور میں اپنی تاک میں تھا کہ ذرا بھیڑ کم ہو یا پادری صاحب کا سلسلۂ سخن[2] منقطع ہو تو کتاب مانگوں۔ لیکن نہیں معلوم پادری صاحب کو میرے قیافے سے یا کس طرح پر معلوم ہو گیا کہ میں اُن سے کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ ہی پوچھا کہ "صاحبزادے تم کچھ مجھ سے کہو گے"۔ میں نے کہا کہ "آپ سب لوگوں کو کتابیں دیتے ہیں۔ ایک کتاب مجھ کو بھی دیجئے"۔

پادری صاحب :۔ بہت خوب۔ اس الماری میں۔ سے تم ایک کتاب پسند کر لو۔

میں نے سُنہری جلد کی ایک بڑی موٹی سی کتاب چھانٹی، پادری صاحب نے کہا کہ "مجھ کو اس کے دینے میں کچھ عذر نہیں، لیکن تم اس کو پڑھ بھی سکو گے؟ کون سی کتاب تم پڑھتے ہو؟

میں۔ بہار دانش۔

---

[1] برداشت [2] باتوں کا تار۔

پادری صاحب "بھلا تمھارا آج کا سبق میں بھی سنوں"
میں نے جزدان میں سے کتاب نکال پڑھنا شروع کیا۔ اُس دن کا سبق کمبخت ایسا فحش اور بیہودہ تھا کہ لوگوں کے مجمع میں مجھ کو اس کا پڑھنا دشوار تھا۔ بمشکل کوئی دو تین سطریں میں نے پڑھی ہوں گی کہ پادری صاحب نے فرمایا "بیشک تم نے جو کتاب پسند کی ہے اُس کو بخوبی پڑھ سکو گے اور وہ کتاب میں تم کو خوشی سے دیتا ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں کہ کیوں میں نے تم کو ایسی کتاب کے پڑھنے کو کہا۔ جس کے پڑھنے سے تم اور سننے سے میں اور یہ سب صاحب جو کھڑے ہوئے ہیں خدا کے گنہگار ہوئے خدا ہم سب کی خطا معاف کرے۔ اور تم چاہے میری دوسری بات مانو یا نہ مانو لیکن اس کتاب کو تم ضرور چھوڑ دو کہ اس کا مطلب تمھارے مذہب کے بھی بالکل خلاف ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ایسے پڑھنے سے نہ پڑھنا تمھارے حق میں بہت بہتر ہے، یہ کتاب جو تم پڑھتے ہو تم کو گناہ اور بُرائی سکھاتی اور بداخلاقی اور بیحیائی کی خراب راہ دکھاتی ہے"

باوجودیکہ لوگ پادری صاحب کی ہر ہر بات کو کاٹتے تھے مگر اس کو سب نے تسلیم کیا۔ پادری صاحب سے جو کتاب میں مانگ کر لایا تھا اُس کا نام تو مجھ کو معلوم نہیں مگر سلیس اُردو میں کسی خدا پرست[1]

---

[1] خدا کو پوجنے والا۔

اور پارسا آدمی کے حالات تھے۔ اگرچہ فی الواقع میں اُس کتاب کو جلد ہی کے لالچ سے لایا تھا لیکن میں نے کہا لاؤ دیکھوں تو اس میں لکھا کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اُس کو دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں میں اُس کو پڑھتا جاتا تھا۔ میرا دل اُس میں لگتا جاتا تھا اور اُس کی باتیں مجھ کو بھلی معلوم ہوتی جاتی تھیں۔ اُس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرزِ زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اور میں روئے زمین پر بدترین مخلوقات ہوں۔ اکثر اوقات مجھ کو اپنی حالت پر رونا آتا تھا اور گھر والوں کا وطیرہ دیکھ کر مجھ کو ایک وحشت ہوتی تھی یا تو میری یہ کیفیت تھی کہ مصیبت مند لوگوں کو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا یا اُس کتاب کی برکت سے دوسروں کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف سمجھنے لگا۔ مکتب اور بہار دانش دونوں کو میں نے اُسی دن سلام کیا تھا۔ جس روز کہ پادری صاحب نے مجھ کو نصیحت کی۔

گھر میں اکیلا پڑا ہوا دن بھر اسی کتاب کو دیکھا کرتا۔ مکتب کے لڑکے چند بار مجھ کو بلانے آئے مگر میں نہ گیا۔ آخر خود میاں جی صاحب تشریف لائے اور میں نے جی کو مضبوط کر کے اُن سے صاف کہہ دیا کہ مجھ کو پڑھنا منظور نہیں۔ آپ اُن دنوں دھن میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز نصیبوں کی شامت، میں نہیں معلوم کہاں چلا گیا۔ میری غیبت میں وہ کتاب کہیں بھائی جان کی نظر پڑ گئی اور شب برات کے

ے دُرویش۔ متقی۔

کوئی چار پانچ دن باقی تھے ۔ بھائی جان کو پٹاخوں کے واسطے ردّی درکار تھی ۔ بے تامّل کتاب کو چیر پھاڑ برابر کر دیا۔
میں نے آکر دیکھا بہتیرا سر پٹکا کیا ہوتا تھا دوڑا ہوا چوک گیا ، کہ پادری صاحب ہوں تو دوسرا نسخہ لاؤں مگر معلوم ہوا کہ صاحب آگرہ چلے گئے ہیں ۔ کفِ افسوس مَل کر رہ گیا ۔ بھائی صاحب کے دوستوں سے شکایت کی تو انھوں نے کہا میاں شکر کرو کہ وہ کتاب پھٹ گئی ، نہیں تو تم کرشتان ہی ہو گئے ہوتے ۔ یہ جواب سُن کر تو مجھ کو ایک نئی حیرت پیدا ہوئی کہ اگر کرشتان ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کا حال میں نے اُس کتاب میں پڑھا تو اُن کو بُرا سمجھنا کیا معنیٰ ؟ خیر چندے یہ خیالات رہے اُس کے بعد تو میں مدرسے میں داخل ہوا اور دوسری طرف متوجہ ہو گیا ۔ اگر آپ کے نزدیک میرے خیالات دین مذہب سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں تو یہ صرف اُس کتاب کا اثر ہے ورنہ دین کا کوئی رسالہ بھی مجھ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔
باب ۔ اہلِ اسلام اور عیسائیوں کے معتقدات میں کچھ اختلاف ہے مگر پھر بھی جس قدر کہ عیسائیوں کا مذہب ، اسلام سے ملتا ہوا ہے اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں ملتا ۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور اُن کے بزرگانِ دین قسیسوں[1] اور راہبوں[2] کی تعریف آئی ہے ۔ عیسائیوں کی نرم دلی اور خاکساری کی مدح کی ہے ۔ اُن کی انجیل

[1] عیسائیوں کے بزرگ [2] عابد ۔

کلام الٰہی ہے ۔ عیسائیوں کے ساتھ مواکلت[1] درست، مناکحت[2] روا غرض اس قدر مغایرت[3] کہ اہل اسلام عیسائیوں کے ساتھ برتتے ہیں ایک امر ناشروع[4] ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مذہب کی عمدہ کتابیں تمھارے دل پر پادری صاحب کی کتاب سے بہتر اثر کرتیں ۔ خصوصاً جو ضرورت کہ مجھ کو درپیش ہے مجھ کو یقین ہے کہ تمھارا اُس کتاب کو دیکھ لینا اُس میں بہت کام آئے گا ۔ ہمدردی کی جیسی کچھ تاکید ہے تم نے اُس کتاب میں دیکھا ہو گا ۔

بیٹا ۔ اگر وہ مذہبی کتاب تھی تو میں جانتا ہوں کہ خاکساری و ہمدردی شرط عیسائیت ہے ۔

باپ ۔ شرط عیسائیت بلکہ شرط انسانیت ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت[5] کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں[6]

لیکن میں تم سے سننا چاہتا ہوں کہ تم اس فرض کی تعمیل کہاں تک کرتے ہو؟

بیٹا ۔ جناب شاید اگر میں اس کو ہمدردی کہہ سکوں تو مدرسے کا جو لڑکا مجھ سے کچھ پوچھنا یا پڑھنا چاہتا ہے میں اُس میں مطلق دریغ[7] نہیں کرتا ۔ گو میرا ذاتی خرچ بھی ہوتا ہو، امتحان سالانہ میں مجھ کو

---

[1] آپس میں ساتھ کھانا [2] باہم نکاح کرنا [3] باہم علیحدگی اور غیرت [4] وہ کام جو شرع کے خلاف ہو [5] عبادت ۔ بندگی [6] فرشتے [7] بخل ۔

نقد روپے لے تھے - میں نے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا۔ محلے میں چند آدمی رہتے ہیں جن کو میں محتاج سمجھتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً اُن کو اُس میں سے دیتا رہا بلکہ ایک مرتبہ میں ایک دقت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔

باپ۔ وہ کیا؟

بیٹا۔ ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی نجھ کو اماں جان نے بنا دی تھی۔ وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے میں خالہ جان کے یہاں جاتا تھا۔ میاں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپراسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی وہاں جمع تھے یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں جا گھسا تو معلوم کیا ہوا کہ ایک نہایت غریب بوڑھی سی عورت ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں۔ سرکاری پیادے اُس کے میاں کو پکڑے لئے جاتے تھے۔ اس واسطے کہ اُس نے کسی بنیے کے یہاں سے اُدھار کھایا تھا اور بنیے نے اس پر ڈگری جاری کرائی تھی وہ مرد مانتا تھا کہ قرضہ واجب ہے مگر کہتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس وقت بالکل تہی دست ہوں۔ ہر چند اُس بیچارے نے بنئے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری ہی خوشامد کی مگر نہ بنیا مانتا تھا نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑے لئے چلے جاتے تھے لوگ جو وہاں کھڑے تھے اُنھوں نے بھی کہا، لالہ جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ تو بنیا بولا اجی میاں جی

ؔ تہی دست= مُفلس ۱۲

اچھی کہی!! برسوں کا نانواں[1] اور روج (روز) کی ٹال مٹول، بھگوان جانے ابھی تو کھاں صاحب (خاں صاحب) کی اجت (عزت) اُڑوائے لیتا ہوں۔ وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی غریب تو تھا لیکن غیرتمند بھی تھا۔ بنیے نے جو عزت اُڑوانے کا نام لیا۔ سُرخ ہوگیا اور گھر میں گھس تلوار میان سے نکال۔ چاہتا تھا کہ بنیے کا سر الگ کر دے کہ اُس کی بیوی اُس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رُو کر کہنے لگی خدا کے لیے کیا غضب کرتے ہو؟ یہی تمھارا غصہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچوں پر ہاتھ صاف کرو۔ کیونکہ تمھارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں، ماں کو روتا دیکھ بچے اس طرح ڈاڑھیں مار مار کر روئے کہ میرا دل ہل گیا اور دوڑ کر سب کے سب باپ کو لپٹ گئے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر خاں صاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان کر کھونٹی سے لٹکا دیا، اور بیوی سے کہا، اچھا تو نیک بخت! پھر مجھ کو اس بے عزتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔ بی بی نے کہا "بلا سے جو چیز گھر میں ہے اُس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ہوگی دیکھی جائے گی۔ توا۔ چکی۔ پانی پینے کا کٹورہ۔ نہیں معلوم کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں بس یہی اُس گھر کی کل کائنات تھی۔ چاندی کی دو دو چوڑیاں لیکن ایسی پتلی جیسے تار۔ اُس نیکبخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ سب سامان خاں صاحب نے باہر

---

[1] نام لکھا قرضہ۔

لاکر اُس بنیے کے روبرو رکھ دیا۔ اوّل تو بنیا اُن چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا لوگوں نے بہت کچھ کہا سُنا۔ یہاں تک کہ اُن سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا۔ اُنھوں نے بھی بنیے کو سمجھایا۔ بارے خدا خدا کرکے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ پانچ روپیہ اصل اور دُو روپیہ سود ساتوں کے ساتوں دیدیں تو فارغ خطی لکھ دے لیکن خاں صاحب کا کُل اثاثہ چار ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ڈھائی روپے کی کسر رہ گئی ہے تو بی بی نے کہا "اب تو کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں۔ ہاں، لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں۔ دیکھو جو اِن کو ملاکر پوری پڑے۔ وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی بس بعینہٖ جتنی ہماری حمیدہ۔ ماں جو لگی اُس کی بالیاں اُتارنے تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل میں کہا کہ الٰہی اس وقت مجھ سے کچھ بھی اس کی مدد نہیں ہو سکتی؟ فوراً دل میں آیا کہ ایک روپیہ اور کوئی دُو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں۔ دیکھوں ٹوپی بک جائے تو شاید خاں صاحب کا سارا قرضہ چُک جائے۔ بازار تو قریب تھا ہی فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال تو سر سے لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے، ایک گوٹے والے کو دکھائی اُس نے چھ کی آنکی۔ میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا۔ لا بلا سے چھ ہی دے۔ غرض چھ وہ اور ایک میرے پاس نقد تھا ہی۔ ساتوں روپے لے، میں نے چُپکے سے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ تب تک پیادے

خاں صاحب کو گرفتار کر کے لے جا چکے تھے اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتاً پورے سات روپے ہاتھ میں دیکھ اُس عورت پر ایک شادی مرگ[1] کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس خوشی میں اُس نے کچھ نہیں سوچا کہ روپیہ کیسا ہے اور کس نے دیا ہے۔ فوراً اپنے ہمسائے کو روپیہ دے کر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ بات کی بات میں خاں صاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو کیسی خوشی کہ کودیں اور اُچھلیں۔ کبھی باپ کے کندھے پر اور کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پر ایک۔

اب اُس عورت کو میرا خیال آیا، اور بچوں سے بولی کہ "کمبختو! کیا اُدھم مچاتے ہو، (اور میری طرف اشارہ کر کے کہا) دُعا دو اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو جس نے آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں۔ نہیں ٹکڑا بھی مانگا نہ ملتا۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اُس کو تمھارا درد ہوتا اور اس مصیبت کے وقت تمھاری دستگیری کرتا۔ صرف ایک باپ کے دَم کا سہارا کہ اللہ رکھے اُس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو محنت سے مزدوری سے خدا کا شکر ہے روکھی سوکھی روز کے روز دُو وقت نہیں تو ایک ہی وقت سے تو جاتی ہے۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان نہ پہچان نہ رشتہ نہ ناتا۔ اور اس اللہ کے بندے نے بھر مٹھی روپے دیکر آج ہم سب کو

[1] ایسی خوشی کہ جس سے موت واقع ہو۔ مراد بیحد خوشی۔

نئے سرے زندہ کیا۔" وہ بچے جس شکر گزاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے اُس کی مسرت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں، روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی جیسی کہ اُس دن تھی۔

مگر دونوں میاں بی بی کے ذہن میں اُس وقت تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیہ اُن کو دیدیا۔ وہ سمجھے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے۔ وہ عورت مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی، میں ہر چند منع کرتا رہا۔ جلدی سے اُس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میاں سے بولی "نوج کوئی تم جیسا بیخبر ہو، کھڑے کیا ہو، جاؤ ایک گلوری بازار سے میاں کے لئے لگوا لاؤ۔"

میں۔ نہیں۔ میں پان نہیں کھاتا۔ تکلیف مت کرو۔

عورت۔ بیٹا! تمھاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف، جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمھارے تلوؤں میں بچھادوں۔ قربان اس پیاری پیاری صورت کے۔ نثار اس بھولی بھولی شکل کے۔ بیٹا! تم یہ بتاؤ کہ تم ہو کون؟

میں۔ میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں۔

عورت۔ پھر، بیٹا یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لوگے؟ ہم اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمھارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے مگر کام ان دنوں مندا ہے۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑے گا دو ہی مہینے میں۔ مگر جہاں تم نے اتنی مہربانی کی ہے۔ للہ اتنا سلوک اور کرد

کہ دو روپیہ مہینہ لے لیا کرو۔
ہیں۔ آپ روپے کے ادا کرنے کی کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے
لینے کی نیت سے نہیں دیا۔
یہ سُن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں
کر سکتا۔ اور میں اُن میں اِس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جیسے
خوش دل اور شکر گزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقۂ مریدان ارادتمند[1]
میں کوئی پیر و[2] مرشد۔ اُس عورت کے مُنھ سے ارے خوشی اور شکر گزاری
کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں
کو چومتی اور آنکھوں سے لگاتی تھی۔ اُسی کی بلاؤں میں رومال سر پر
سے کھسک گیا تو اُس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں۔ پوچھا تو مجھ کو
کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیہ دیا۔ پھر تو اُس کا یہ حال تھا
کہ بچھی جاتی تھی۔ سات روپے کی بھی کچھ حقیقت تھی مگر اُس نے
مجھ کو سیکڑوں ہزاروں ہی دعائیں دی ہوں گی۔ اُس نے جو اتنی
احسانمندی ظاہر کی تو میں اُلٹا اُسی کا ممنون ہوا۔ جس قدر خوشامد
کرتی تھی میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی
میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔
غرض میں وہاں سے رُخصت ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے
سیدھا گھر لوٹ آیا۔ عین گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے

[1] خوش اعتقاد شاگردوں کا گھیرا [2] اُستاد۔

میری ہیئت[1] کذائی دیکھ کر تعجب کیا اور پوچھا کہ "ایں، کیا ٹوپی لے بدلے چنے لے کھائے؟" میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس واسطے کہ مجھ کو اُس بات کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ شام کو بھائی جان سے اور اماں جان سے تکرار ہوئی۔ بھائی جان کچھ روپے مانگتے تھے اور اماں جان کہتی تھیں بیٹا ان فضول خرچیوں سے گھر کے دن چلے گا؟ لو پرسوں میں نے تم کو چار روپے دیے تم نے چاروں کے چاروں برابر کیے ناخن بھر چیز تم گھر میں لائے ہو تو بتا دو؟ اتنا چٹورپن ایسا اسراف[2]؟ بھائی جان نے کہا میں چٹورا نہیں ہوں۔ چٹورے تمھارے۔ منجھلے صاحبزادے ہیں۔ جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی ہو کہ سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے۔ اماں جان نے مجھ کو بلا کر پوچھا۔ میں نے کہا اگر بیچ کر کھا جانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

اماں جان۔ پھر کیا کہیں کھو دی؟

میں۔ کھوئی بھی نہیں

اماں جان۔ بھائی تو تو عجب تماشے کا لڑکا ہے، بیچی نہیں۔ کھوئی نہیں۔ پھر ٹوپی گئی تو کہاں گئی؟

میں۔ اگر آپ کو میری بات کا اعتبار ہے تو بس سمجھ لیجیے کہ میں نے کہیں اُس کو بیجا طور پر صرف نہیں کیا۔

اماں جان۔ اگر یہی تمھارے لچھن ہیں تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبویا۔

---

[1] بے ڈھنگی حالت موجودہ [2] فضول خرچی۔

میں، اُس وقت عجب مشکل میں مبتلا تھا۔ ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور بے ظاہر کئے بن نہیں پڑتی تھی۔ ع

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل[1]

مگر مجھ کو یقین تھا کہ جب میرا معاملہ پاک صاف ہے تو گو بالفعل بھائی جان کے کہنے اور میرے چُپ رہنے سے امّاں جان کو ایک بدگمانی سی ہوگئی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ضرور اُن کے دل سے خدشہ دفع ہو ہی جائے گا۔ اور کچھ نہ ہوگا تو میرے اگلے پچھلے فعلوں کو دیکھ کر اتنا تو جی میں سمجھ لیں گی کہ بیٹا بدراہ[2] نہیں ہے۔ نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے۔ سو خدا کی قدرت، ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی تو امّاں جان اُس کی عیادت کو گئیں۔ میں اُن کے ساتھ تھا ابھی امّاں جان سواری سے نہیں اُتری تھیں کہ اُدھر سے وہی خاں صاحب، چلے آرہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر دُور ہی سے دعائیں دینے لگے اور ایسے تپاک[3] اور دلسوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی کہ جیسے کوئی اپنا بزرگ اور اپنا عزیز دریافت حال کرتا ہے۔ خیر میں نے مناسب حالت جواب دیا۔ امّاں جان، آخر یہ سب باتیں پردے کے اندر بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں۔ اُترتے کے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا "علیم یہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کرتا تھا؟

میں۔ یہ ایک خاں صاحب ہیں اور میاں مسکین کے کوچے میں

[1] کہوں تو مشکل نہ کہوں تو مشکل [2] بدطریق [3] بیحد ادب اور دلی ہمدردی۔

رہتے ہیں۔ بس میں اسی قدر جانتا ہوں۔

امّاں جان ۔ لیکن باتیں تو تم سے ایسے گردیدہ ہو ہو کر تے تھے کہ گویا برسوں کی جان پہچان ہے؟

میں ۔ نہیں۔ شاید اُن کو میرا نام بھی معلوم نہیں۔

امّاں جان ۔ پھر تمھارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے!

میں ۔ بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف[1] میں بھی بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں۔

اگرچہ میرے جواب سے امّاں جان کی تشفی نہیں ہوئی مگر ان کو اندر جانے کی جلدی تھی۔ چلی گئیں۔ خاں صاحب نے کہیں اپنے گھر میرا تذکرہ کیا۔ میں تو گھر چلا آیا مگر غالب ہے کہ ان کی بیوی امّاں جان کے پاس گئیں اور میرے اُس ٹوپی بیچنے اور روپیہ دینے کا تمام ماجرا بیان کیا۔ پھر جو امّاں جان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں "علیم ہم نے تمھاری چوری آخر پکڑی پر پکڑی"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ میری چوری؟

امّاں جان ۔ جی ہاں چوری۔

میں ۔ بھلا میں بھی سُنوں۔

امّاں جان ۔ کیوں! تم پہلے ٹوپی کا حال بتاؤ تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سُنو۔ اتنا کہنے سے میں سمجھ گیا اور ہنس کر چپ ہو رہا۔

باپ ۔ بیشک۔ جتنی باتیں تم نے بیان کیں۔ داخل ہمدردی ہیں

---

[1] جان پہچان۔

خصوصاً یہ خاں صاحب کا قصہ ہمدردی کی ایک اعلیٰ درجہ کی مثال ہے
لیکن چشمے سے پہلے وہ مقامات سیراب ہونے چاہئیں جہاں سے وہ
چشمہ نکلا ہے۔ اسی طرح پہلے اپنے عزیز واقارب نیکی اور سلوک کے
مستحق ہیں۔

بیٹا۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرے قریب کے رشتہ دار
میرے سلوک کے حاجتمند نہیں ہیں اور خدا نے اُن کو مجھ سے بے نیاز[1]
اور مستغنی کیا ہے۔

باپ۔ کیا سلوک صرف روپے پیسے ہی کے دینے سے ہوتا ہے!

بیٹا۔ میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا۔

باپ۔ نہیں جو جس چیز کا حاجتمند ہے اُس کا رفع حاجت کرنا
ہمدردی اور نفع رسانی ہے۔ ہمارا خاندان دینداری سے بے بہرہ
اور خدا شناسی سے بے نصیب ہے اور شیوۂ خدا پرستی میں ہر ہر متنفس
کو تعلیم و تلقین کی حاجت اور وعظ و نصیحت کی ضرورت ہے۔ تم نے
اس فرض کو ادا کرنا تو درکنار ابھی تک فرض ہی نہیں سمجھا۔

بیٹا۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔

باپ۔ اور تم سے کہیں زیادہ غلطی میری ہے۔ بہرکیف اب بھی
تلافی مافات کرنی ضرور ہے اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اپنے
گھر میں کسی کو لایعنی طور پر زندگی نہ بسر کرنے دوں۔ اگرچہ میں اس بات کو

[1] بے پروا

نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ اب اصلاح کا وقت باقی نہیں اور میرا عزم ۔ عزم بےہنگام[1] ہے لیکن اگر تم میری مدد کرو تو میں کامیابی کی بہت کچھ اُمید کر سکتا ہوں ۔

بیٹا ۔ انشاء اللہ آپ مجھ کو نافرمان بیٹا اور ناخلف فرزند نہیں پائیں گے ۔ مگر مجھ کو حیرت ہے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکوں گا؟

باپ ۔ تمہارا یہی مدد کرنا ہے کہ بس تم دینداری کا نمونہ بن جاؤ اور اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں تم نے بضرورت امتحان موسمی توبہ کر رکھی ہے ۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ گنجفہ ۔ شطرنج ۔ کنکوا ۔ بٹیر ۔ مرغ ۔ تمام مشاغل لایعنی کے ترک کا عہد واثق[2] کرو ۔

بیٹا ۔ یہ تو سراسر میری منفعت کی بات ہے ۔ اور اگر میں اس میں کسی طرح کا انکار کروں تو آپ کی نافرمانی ۔ اپنی خرابی ۔ خدا کا گناہ ۔ دُنیا کی بدنامی ۔ عاقبت کی رسوائی کوئی پہلو بھی تو اچھا نہیں اور اگر بالفرض آپ کوئی ایسی بات بھی فرماتے جس میں میرا نقصان ہوتا تاہم مجھ کو سوائے تعمیل ارشاد کیا چارہ تھا؟ بندہ اور خدا غلام اور مالک ۔ رعیت اور بادشاہ ۔ نوکر اور آقا ۔ بی بی اور شوہر ۔ شاگرد اور اُستاد ۔ بیٹا اور باپ میں تو جانتا ہوں یہ سب کچھ ایک ہی طرح کی نسبتیں ہیں ۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ میرا طرز زندگی آئندہ ایسا ہی ہوگا جیسا آپ کو منظور رہے ۔

---

[1] بے وقت کا ارادہ [2] پکا ۔

باپ - بارک اللہ[1] وجزاک اللہ[2]، بس تم نے آج مجھ کو مطمئن کر دیا۔ خدا تم کو دُنیا اور دین دونوں میں سُرخرو رکھے۔ اچھا اب جاؤ اپنا کام کرو ذرا اپنے بڑے بھائی کو میرے پاس بھیج دینا۔

بیٹا - شاید آپ یہی گفتگو اُن سے کرنی چاہتے ہیں؟

باپ - ضرور۔

بیٹا - اگر بالمشافہہ[3] اُن سے گفتگو نہ ہوتی تو میرے نزدیک بہتر تھا۔

باپ - تمھارا خوف بیجا نہیں ہے۔ میں کئی دن سے اس بات میں غور کر رہا ہوں۔ آخر کار یہی تجویز ٹھہری کہ ایک دفعہ مجھ کو رُود رُرُو اتمام[4] حجت کر دینا ضرور ہے۔

---

[1] خدا برکت دے تجھ کو [2] خدا بدلا دے تجھ کو [3] آمنے سامنے - رُو در رُو - [4] حجت تمام کر دینا۔

۵۷

فصل ہفتم

نصوح نے بڑے بیٹے کلیم کو بلایا اور ہر چند فہمیدہ اور علیم نے سمجھایا مگر وہ نہ آیا پر نہ آیا

غرض علیم رخصت ہو کر مردانے مکان میں گیا تو میاں کلیم کو پیام طلب جا سنایا۔

کلیم۔ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ آج کل تو ہم لوگوں پر بڑی عنایت ہے۔

علیم۔ بھلا کبھی عنایت نہیں بھی تھی؟

کلیم۔ اس کو کوئی سلیم[1] سے پوچھے۔

اتنے میں سلیم دروازے سے نمودار ہوا۔ مگر اس سے پہلے وہ اپنا سر منڈا چکا تھا اور اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو بڑے بھائی جان دیکھ لیں چاہتا تھا کہ چپکے چپکے دبے پاؤں گھر میں گھس جائے لیکن جوں ہی بیچارے نے دروازے کے اندر قدم رکھا تھا کہ کلیم نے آواز دی ہا سلیم تو

[1] تعریض ہے حال سابق پر کہ سلیم شوخی کے پیچھے اکثر باپ کے ہاتھ سے پٹتا رہا تھا۔

بھائی کی آواز سن کر کانپ اٹھا اور سمجھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے مگر منجھلے بھائی کو بیٹھا ہوا دیکھ کر کسی قدر دم میں دم آیا۔ اور پاس نہ آ کر بے پوچھے کہنے لگا کہ "ابا جان کے حکم سے میں نے آج بال منڈوا دیے"۔

بڑا بھائی (منجھلے کی طرف مخاطب ہو کر) دیکھئے! ع

صورت[1] ببیں۔ حالش مپرس

ایک شفقت پدری تو یہ ہے کہ بیچارے کی اچھی خاصی صورت کو لے کر بگاڑ دیا اور برسوں کی کمائی خاک میں ملوا دی۔

کیوں سلیم! تمہارا دل تو بالوں کے واسطے بہت کڑھا ہوگا؟

چھوٹا بھائی۔ میں تو خود ایک مدت سے بالوں کے منڈوا دینے کی فکر میں تھا۔ بلکہ شاید آپ کو یاد ہو، ایک مرتبہ سر کھول کر حجام کے روبرو بیٹھ گیا تھا۔ آپ خفا ہونے لگے تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

بڑا بھائی۔ آہا اب مجھ کو یاد آیا کہ تمہارے اُن چار یاروں نے جن کو میں مکر و فریب کے عناصر[2] اربعہ سمجھتا ہوں تم کو بہکایا تھا۔

چھوٹا بھائی۔ آپ ناحق اُن بیچاروں کو بُرا کہتے ہیں وہی بات تو ابا جان نے بھی کہی۔

---

[1] چونکہ بالوں کا منڈوانا کلیم کے خلاف مزاج تھا اور پہلے پہل اُسی سے مُنڈبھیڑ ہوئی [1] صورت ہی دیکھ لو۔ حالت پوچھنے کی کیا ضرورت ہے [2] وہ چار جز وجن سے مل کر انسان کا جسم بنا ہے۔ یعنی آگ۔ پانی۔ ہوا۔ مٹی۔ (کلیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مجسمہ بجائے ان چار چیزوں کے مکرہ فریب سے بنا ہے)

بڑا بھائی - ابّا جان نے ابھی بیماری سے اُٹھ کر کہی یا کبھی پہلے بھی کہی تھی ؟

چھوٹا بھائی - نہیں پہلے تو کبھی کچھ نہیں کہا -

بڑا بھائی - پھر سمجھ لو کہ ابّا جان کو خللِ دماغ ہے - میں نے تو شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر نے جو اسہال بند کرنے کی دوا دی ہے ابخرے دماغ کو چڑھ گئے ہیں -

منجھلا بھائی - یہ کیسی بات آپ کہتے ہیں ؟ ابھی میں ابّا جان کے پاس سے چلا آتا ہوں - دو گھنٹے تک برابر مجھ سے گفتگو کرتے رہے میرے نزدیک تو اُن کے خیالات پہلے سے کہیں عمدہ اور معقول ہو گئے ہیں -

بڑا بھائی - سُنتا ہوں کہ ان دنوں نماز بہت پڑھا کرتے ہیں -

منجھلا بھائی - تو کیا اسی کو آپ نے خللِ دماغ قرار دیا ہے ؟

بڑا بھائی - کیا خللِ دماغ کے سر میں سینگ لگے ہوتے ہیں ؟ بیمار ہو کر اُٹھے بیٹھے کوئی بڑا بھاری جلسہ کرنے کہ شہر میں نام ہوتا - اُٹھے بھی تو اونگھتے ہوئے - دو چار مرتبہ میں نے اُن کو مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا ہے - یہ نوری جولاہہ تو امام بنتا ہے - اور محلّے کے سقّے ، حجّام ، کنجڑے ، مسجد کے مسافر - اس قسم کے لوگ اُس کے مقتدی[ل] ہوتے ہیں - اور اُنھیں میں یہ حضرت بھی جا کر شریکِ نماز ہوتے ہیں - بھائی میں تو تم سے سچ کہوں ، یہ دیکھ کر مجھ کو اس قدر شرم آتی ہے کہ میں نے

ل امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے -

اُدھر کا راستہ چلنا چھوڑ دیا اور یہ مُلّا نے جو خدا کی قدرت، ہمارے ابّا جان کے ہمنشین بنے ہیں اس قدر تو ذلیل[1] اوقات ہیں کہ دعوت کے لقموں اور مسجد کی روٹیوں پر تو ان کی گزر ہے مگر مغرور بھی پرلے ہی سرے کے ہوتے ہیں۔ کبھی راہ میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو خیر، یہ تو مجال نہیں کہ سلام نہ کریں۔ لیکن اتنے بڑے ٹرّے کہ بندگی نہ آداب نہ تسلیم، دُور ہی سے السلام علیکم کا پتھر کھینچ مارتے ہیں۔ ہاتھ یہ نہیں اٹھاتے، سر یہ نہیں جھکاتے اور اُس پر طُرّہ یہ کہ سو قدم سے مصافحہ کو ہاتھ پھیلا کر لپکتے ہیں ع

درازدستی[2] ایں کوتہ آستیناں بیں

سلیم تم کو صرف سر ہی منڈوانے کا حکم تھا یا نماز کی بھی ہدایت ہوئی ہے؟

چھوٹا بھائی۔ جناب نماز کے لئے تو سخت تاکید کی ہے کہ خبردار کسی وقت کی قضا نہ ہونے پائے اور اس کے علاوہ کنکوا اڑانا۔ شطرنج کھیلنا۔ جانوروں کی لڑائی میں شریک ہونا۔ جھوٹ بولنا۔ قسم کھانا۔ بیہودہ بات بکنا۔ بُرے لڑکوں میں بیٹھنا۔ ان سب باتوں سے منع کیا ہے۔

بڑا بھائی۔ کیوں نہیں۔ تم سے ایک ہی بات کہہ دی کہ مر رہو۔ منجھلا بھائی یہ جملہ سُن کر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ "کیا آپ کے نزدیک ان شرطوں کی تعمیل کرنا اور مرنا دونوں برابر ہیں؟

---

[1] کم ظرف۔ مفلس [2] ذرا ان چھوٹی آستین والوں کی درازدستی دیکھنا۔ مراد یہ کہ یہ زاہد بڑے ریاکار اور فریبی ہیں۔

بڑا بھائی: جب تمام کھیلوں کی ممانعت اور لوگوں سے ملنے اور بات کرنے کی بندی ہوئی تو تم ہی انصاف کرو کہ ایسے جینے اور مرنے میں کیا امتیاز ہو سکتا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

منجھلا بھائی: میں تو سمجھتا ہوں کہ ہماری بالفعل کی زندگی کی نسبت اس طرح کی زندگی میں جو ابا جان تعلیم کرتے ہیں روحی[1] مسرت زیادہ ہے۔ اگرچہ میں کھیل کود کی چیزوں میں خصوصاً ان دنوں کم مصروف ہوتا ہوں۔ اس واسطے کہ مدرسے کے کام سے فرصت نہیں ملتی مگر جتنا مصروف ہوتا ہوں اس سے سوائے کوفت اور کبیدگی[2] کے میں تو کوئی نتیجہ نہیں دیکھتا۔ رہا یار دوستوں کا مشغلہ سو میں ان میں سے کسی کو کسی کا دوست نہیں سمجھتا۔ بھلا کوئی سے دوست ایسے بتائیے جن میں ہر روز تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت نہ پہنچتی ہو۔

بڑا بھائی: پھر بھی یہ لوگ اُن حجّاموں اور کُنجڑوں اور مسجد کے مسافروں سے بہتر ہیں۔ جو نمازیں پڑھ پڑھ کر شریف بننا چاہتے ہیں ؎

زنہار[3] ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبیؐ را بدرودے

---

[1] روح کی خوشی [2] رنجیدگی [3] کہیں تو ایسے لوگوں میں شریک نہ ہو جانا جو خدا کو سجدوں سے اور نبیؐ کو ایک درود سے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

منجھلا بھائی۔ اگر شریف ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہم اور ہمارے یار دوست ہیں تو میرے نزدیک ایسی شرافت پر کوئی معقول پسند آدمی ناز نہیں کر سکتا۔ کون سی بیہودگی ہے جو ہم لوگ نہیں کرتے؟ خصوصاً جبکہ اکٹھے ہوں۔ کون سی بے تہذیبی ہے جس کے مرتکب ہم نہیں ہوتے خاص کر اُس وقت کہ ایک دوسرے سے ملیں۔ دھول دھپّا۔ لام کاف۔ چھیڑ چھاڑ۔ مار کٹائی۔ دھینگا مُشتی۔ ہاتھا پائی۔ کس خاص چیز کا نام لوں۔ ایک جلسہ اور دُنیا بھر کی تفضیح[۱] ۔ ایک مجمع اور زمانے کی رسوائی۔ نام کے شریف اور پاجیوں کی سی عادت۔ کہنے کو بھلے مانس اور بازاریوں جیسی طبیعت۔

بڑا بھائی۔ چلو خیر معلوم ہوتا ہے کہ تم تو بیعت[۲] کرنے کو تیار بیٹھے ہو۔

منجھلا بھائی۔ تیار کیسا، ابھی تو بیعت کئے چلا آتا ہوں۔

بڑا بھائی۔ سلیم! تم اپنی کہو؟

چھوٹا بھائی۔ جناب میں ان سے پہلے مُنڈ چکا ہوں۔

بڑا بھائی۔ تمھارا منڈنا سند نہیں۔ تمھارا معاملہ ع

درِ[۳] دبستانی بستم می رسند

کا معاملہ ہے مگر (منجھلے بھائی کی طرف اشارہ کر کے) ان کو توڑا تو انھوں نے اپنے نزدیک بڑا کفر توڑا۔ رہ گیا اکیلا میں۔

---

[۱] کھلم کھلا بدنامی اور بُرائی [۲] مُریدی [۳] اگر تو وہ کام نہ کرے گا تو زبردستی کرا لیا جائے۔

منجھلا بھائی۔ آپ اُسی وقت اکیلے ہیں کہ ابّا جان تک نہیں پہنچے۔ گئے اور داخل حلقہ ہوئے۔

بڑا بھائی۔ اجی بس، اس کو دل سے دور رکھیں۔ ع
یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اُتار دے

منجھلا بھائی۔ ابّا جان سے مِلنا شرط ہے۔

بڑا بھائی۔ آخر کریں گے کیا؟

منجھلا بھائی۔ سمجھائیں گے۔

بڑا بھائی۔ ع "میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے"

منجھلا بھائی۔ وہ باتیں ہی اس طرح کی کہتے ہیں کہ لوہے کو پگھلائیں۔ پتھر کو موم بنائیں۔

بڑا بھائی۔ تو کس میں جا بھی چکا۔

منجھلا بھائی۔ یہ بات تو آپ کی بالکل نامناسب ہے۔

بڑا بھائی۔ ع رندِ[1] عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار۔

منجھلا بھائی۔ لیکن شاید ابّا جان نے آپ کو کچھ اور ہی بات کہنے کو بُلایا ہو؟

بڑا بھائی۔ اجی تانت[2] باجی راگ پایا۔ اس کے سوا کے اور کوئی بات نہیں۔

---

[1] جو رند ہیں اور دُنیا کو جلا چکے انھیں مصلحت بینی سے کیا نسبت [2] سرنگی کا تار بجا اور معلوم ہو گیا کہ راگ فلاں چھڑا۔ یعنی ابّا جان کا وہی مطلب ہے جو میں سمجھ گیا۔

منجھلا بھائی۔ اگر ابّا جان نے دوبارہ بلوا بھیجا؟
بڑا بھائی۔ میں جانوں گا کہ ضرور اُن کو خللِ دماغ ہے۔
منجھلا بھائی۔ والد جیسے میرے ویسے آپ کے۔ آپ کو اختیار ہے اُن کی شان میں جو چاہیں سو کہیں۔ لیکن اتنا میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ اس اصرار کا انجام اچھا نہیں۔
بڑا بھائی۔ اتنا میں سمجھتا ہوں لیکن میں اس انجام کی کچھ پروا نہیں کرتا۔
منجھلا بھائی۔ لیکن اس بگاڑ میں آپ فائدہ کیا سمجھتے ہیں؟
بڑا بھائی۔ اور میرا نقصان ہی کیا؟
منجھلا بھائی۔ اگر اور کچھ نقصان نہ بھی ہو تو ابّا جان کی ناخوشی کیا کچھ تھوڑا نقصان ہے؟
بڑا بھائی۔ ع رنج و آزردگی غیر سبب را چہ علاج[1]
منجھلا بھائی۔ اوّل تو ابھی آزردگی کی نوبت نہیں آئی لیکن اگر خدانخواستہ آئے گی تو لوگ اُس کو بے سبب نہیں کہیں گے اور سبب کی ابتدا آپ کی طرف سے ہوتی ہے کہ اُنھوں نے بلایا ہے اور آپ نہیں جاتے۔ بھلا دُنیا میں کوئی باپ ایسا ہوگا کہ فرزند اُس کی نافرمانی کرے اور وہ ناخوش نہ ہو؟
بڑا بھائی۔ اُن کو میرے افعال سے بحث کیا اور میرے

[1] ہر وقت خواہ مخواہ آزردہ ہونے کا کیا علاج۔

اعمال سے تعرض کیوں ؟

منجھلا بھائی - اوّل تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ سے کیا کہیں گے ؟ لیکن مانا کہ وہی کہیں جو مجھ سے اور سلیم سے کہا تو کیا اُن کو نصیحت کا اختیار اور ہدایت کا منصب نہیں ہے ؟

بڑا بھائی - ہے لیکن حمیدہ پر، سلیم پر اور تم پر - کیونکہ تم لوگ بطوع[1] خاطر اُن کی نصیحت سُننی چاہتے ہو -

منجھلا بھائی - کیوں جیسے ہم اُن کے فرزند ویسے آپ ؟

بڑا بھائی - میں فرزند کبھی تھا - اب سینگ[2] کٹا کر بچھڑوں میں ملنا میرے لئے عار ہے - اور میں اپنے تئیں اُن کی حکومت سے مستثنیٰ اور اُن کے اختیارات سے آزاد سمجھتا ہوں -

منجھلا بھائی - لیکن شریفوں میں یہ دستور نہیں ہے کہ اولاد بڑی ہو جائے تو ماں باپ کا ادب و لحاظ اُٹھا دے - میں دیکھتا تھا کہ ابّا جان اس قدر جدّ[3] مرحوم کا پاس[4] کرتے تھے کہ اُن کے سامنے حقّہ پینا کیسا، پان کھانے میں بھی اُن کو تامّل ہوتا تھا کیا آپ نے نہیں دیکھا ؟

بڑا بھائی - لیکن میں نے بھی اس وقت تک ابّا جان کو اُلٹ کر جواب نہیں دیا -

منجھلا بھائی - درست ہے - لیکن یا بآن شوریدہ[5] شوری یا

---

[1] دلی رغبت سے [2] یعنی جوان ہو کر بچّوں کی سی باتیں کرنا اچھا نہیں ہوتا [3] دادا [4] ادب و لحاظ [5] یا ایسی تیزی

باایں ہمہ بے نمکی۔

بڑا بھائی۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے اب بھی اگر ابّا جان میرے حال سے تعرض نہ کریں تو میں کسی طرح کی نافرمانی یا گستاخی کرنی نہیں چاہتا۔

منجھلا بھائی۔ تو اس صورت میں کچھ آپ کی اطاعت بھی محمود[۲] نہیں۔

بڑا بھائی۔ میں مدح سے باز آیا مجھ کو میرے حال پر رہنے دیں اور میرے نیک و بد سے متعرض نہ ہوں ؂

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

منجھلا بھائی۔ اس کا یہ مطلب کہ آپ ان سے قطع تعلق کر چکے۔

بڑا بھائی۔ کیا ضرور ہے کہ جب میں پھر لڑکوں کی طرح مکتب میں پڑھوں تب ہی بیٹا کہلاؤں ورنہ فرزندی سے عاق[۳] کیا جاؤں؟

منجھلا بھائی۔ کوئی آپ سے مکتب میں پڑھنے کے لئے نہیں کہتا۔ اور یہ بھی امید نہیں ہے کہ ابا جان آپ کی بڑائی کا پاس نہ کریں۔

بڑا بھائی۔ جبکہ مجھ کو اپنا نیک و بد سمجھنے اور نفع و نقصان میں امتیاز کرنے کی عقل ہے تو مجھ سے یہ کہنا کہ یہ کرو اور یہ مت کرو گویا مجھ کو بے تمیز لڑکا بنانا ہے؟

---

[۱] ایسا پھیکا پن [۲] قابل تعریف [۳] محروم۔ بے حق۔

منجھلا بھائی۔ کیا انسان کی رائے غلطی نہیں کرتی؟
بڑا بھائی۔ ایسا احتمال اُن کی رائے پر بھی ہو سکتا ہے۔
منجھلا بھائی۔ تو کیوں نہیں آپ اُنھیں سے جا کر گفتگو کرتے کہ بحث ہوہوا کر ایک بات قرار پا جائے؟
بڑا بھائی۔ مجھ کو گفتگو کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ ع
ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند
منجھلا بھائی۔ اُنھیں کو ضرورت سہی اور جبکہ آپ کو اپنی رائے پر وثوق[1] ہے پھر آپ بالمشافہہ گفتگو کرنے سے گریز کیوں کرتے ہیں؟
بڑا بھائی۔ دنیا میں کوئی مباحثہ طے ہوا ہے جو یہ ہوگا؟
منجھلا بھائی۔ ہٹ دھرمی۔ اور تعصب اور سخن پروری[2] نہ ہو تو پھر ہر بحث کا خاتمہ ہے۔
بڑا بھائی۔ ہمارے ابّا جان کو بھی ایک بات کی زٹ[3] لگ جاتی ہے۔ اب نماز روزے کا خیال آگیا ہے تو بس اُسی کی دُھن ہے چند روز بعد دیکھ لینا وہی ابّا جان ہیں، وہی ہم ہیں، اور وہی کھیل تماشے ہیں۔
منجھلا بھائی۔ آپ چونکہ مجھ سے بڑے ہیں بیشک زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن میں بھی ابّا جان کے مزاج سے ناآشنا نہیں ہوں اصلاح خاندان کا اُن کو تہ دل سے خیال ہے اور اس خصوص میں اُن کو

[1] پکا بھروسہ اور اعتماد [2] بات کی پچ [3] لت۔ رٹ

ایک اہتمام خاص ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا ارادہ متزلزل اور عزم ناپائدار ہو اور آپ کے بارے میں جو کچھ اُن کو منظور ہو۔ مگر آپ کے سوائے میں تو گھر بھر میں کسی کو نہیں دیکھتا کہ وہ گھر میں رہے اور اپنا پُرانا ڈھرّا نہ چھوڑے۔

بڑا بھائی - ذرا اماں جان سے اور مجھ سے دو دو باتیں ہو جائیں تو تم کو ارادے کا استحکام اور عزم کا استقلال خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

چھوٹا بھائی - اماں جان تو آج بڑی خفا بیٹھی ہیں۔

بڑا بھائی - کیوں؟

چھوٹا بھائی - آپ کو معلوم نہیں؟ آپا جان سے اور اُن سے آج بڑی لڑائی ہوئی۔

بڑا بھائی - کس بات پر؟

چھوٹا بھائی - آپا جان لڑکا حمیدہ کو دے کر ہاتھ مُنہ دھونے چلی گئیں۔ حمیدہ لڑکے کو بٹھا، نماز پڑھنے لگی، آپا جان نے نماز پڑھتی کو ڈھکیل دیا اُس کی ناک میں تخت کی کیل لگ گئی۔ ڈھیر سا خون نکلا۔ اسی پر تکرار ہونے لگی۔ آپا جان نے کئی مرتبہ توبہ توبہ، نماز کو بُرا کہا۔ امّاں جان نے بار بار منع کیا، نہ مانا۔ آخر اماں جان نے تھپڑ کھینچ مارا۔

بڑا بھائی - سچ کہو؟

چھوٹا بھائی - آپ چل کر دیکھ لیجئے۔ آپا جان کوٹھری میں پڑی رو رہی ہیں۔ صبح سے کھانا نہیں کھایا۔

منجھلا بھائی۔ واقعی کچھ لڑائی ضرور ہوئی ہے۔ میں جو ابا جان کے پاس گیا تو آتے جاتے سب کو چُپ دیکھا اور سمجھا کہ بے سبب نہیں ہے۔

بڑا بھائی۔ کہیں گھر بھر نے متوالی کودوں[1] تو نہیں کھالی، ابھی سے جہاد بھی شروع ہوگیا۔ حمیدہ کا نماز پڑھنا دیکھو اور ایک ذرا سی بات پر بیچاری نعیمہ کے مار کھانے پر خیال کرو۔

منجھلا بھائی۔ میرے نزدیک تو ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کی نہیں۔ حمیدہ نے نماز پڑھی تو کیا کمال کیا۔ باتیں تو بڑی بوڑھیوں کی سی کرتی ہے۔

بڑا بھائی۔ تو کیا ضرور ہے کہ باتیں بڑی بوڑھیوں کی سی کرے تو نماز بھی بڑی بوڑھیوں کی سی پڑھے۔ اس کی عمر گڑیاں کھیلنے، اور ہنڈکلھیاں پکانے کی ہے نہ زہد و مراقبہ[2] کی۔

منجھلا بھائی۔ کیا یہ ایسی مشکل بات ہے کہ حمیدہ اُس کو نہیں سمجھ سکتی؟

بڑا بھائی۔ مار کر سمجھایا جائے تو شاید "صدرا"[3] "شمس بازغہ"[4] کو بھی کہہ دے گی کہ ہاں میں سمجھ گئی۔

منجھلا بھائی۔ لیکن اُس کو تو مار نہیں پڑتی۔

---

[1] ایک قسم کودوں کی جس میں سمیت آجاتی ہے اور اس کا کھانے والا دیوانہ ہو جاتا ہے مراد یہ کہ سارا گھر دیوانہ تو نہیں ہو گیا [2] ولیوں کی ریاضت کاملہ کا ایک ڈھنگ [3] ایک مشہور کتاب فلسفہ [4] کتاب حکمت ہے۔

بڑا بھائی۔ ایک پٹی تو گویا سب پٹیں۔ جب نعیمہ ہی کو امّاں جان نے تھپّڑ کھینچ مارا تو اب کس کی عزّت رہ گئی۔ بڑی بیٹی بیاہی ہوئی صاحب اولاد کو مارنا یہ شرافتِ دیندارانہ ہے؟ ہ

نہ تو کعبہ نہ دیر کے قابل
مذہب اُن کا ہے سیر کے قابل

سلام ہے ایسے دین کو کہ انسان اپنے آپے سے باہر ہو جائے اور دُنیا کے نیک و بد پر کچھ نظر نہ کرے۔ آخر یہ خبر ممکن نہیں کہ اس کی سُسرال نہ پہنچے۔ سمدھیانے والے کیا کہیں گے؟ غیرت ہو تو گھر بھر چُلّو پانی میں ڈوب مریں۔ حیا ہو تو کُنبے میں مُنھ نہ دکھائیں۔ اسی پر تم مجھ کو ابّا جان کے پاس جانے کی رائے دیتے ہو؟ اگر کہیں مجھ پر بھی ایسا ہی دستِ شفقت پھیر دیا تو پھر ع

ایں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے[1]

اور مجھ کو نعیمہ کے جانبر ہونے کی بھی اُمید نہیں ع

سُن لیجیو کہ آج اگر ہے، تو کل نہیں

منجھلا بھائی۔ اس بات کا مجھ کو بھی تعجب ہے لیکن جب تک امّاں جان کے مُنھ سے تمام کیفیت نہ سُن لوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنھوں نے بیجا کیا یا بجا کیا۔

بڑا بھائی۔ تمھارے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہوتا اور پھر تم بیجا اور

---

[1] میں تو ایسا ہوں کہ پھر خاک اور خون میں میرا سر پڑا دکھائی دے۔ یعنی اپنی جان کھو دوں

بجائیں تردد رکھتے تو میں تم کو خلفِ ارشد اور فرزند سعادتمند جانتا۔

جس پہ بیتی ہو یہ وہی جانے

جو کہ بیدرد ہو وہ کیا جانے؟

منجھلا بھائی۔ شاید دقت پر طبیعت کا حال دگرگوں ہو جائے تو خبر نہیں۔ ورنہ میں تو ماں باپ کی تادیب کو موجب بے حرمتی نہیں سمجھتا۔

بڑا بھائی۔ شاید ایسی ہی باتوں نے ان کو دلیر کر دیا ہے؟

منجھلا بھائی۔ جس کو خدا ماں باپ بناتا ہے تو اُس کو اتنی بات کے سمجھنے کی عقل بھی دیتا ہے کہ اولاد پر اُس کو کیسے کیسے اختیارات حاصل ہیں۔

بڑا بھائی۔ غرض تمھارے نزدیک ماں باپ کو اختیار ہے کہ اولاد گو بڑی بھی ہو جائے مگر اُن کو بے تمیز بچوں کی طرح ماریں پیٹیں تو کچھ الزام نہیں۔

منجھلا بھائی۔ مجھ سے فتوئے[۱] طلب نہیں ہے کہ عام رائے دوں البتہ اپنے گھر کے اس خاص معاملہ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ امّاں جان نے جب بہت ہی ضرورت سمجھی ہوگی تو آپا جان پر ہاتھ اٹھایا ہوگا۔ اور فرض کیا کہ امّاں جان ہی کی زیادتی سہی تو کیا ایک طمانچے کے مارنے سے اُن کی عمر بھر کی شفقتیں اکارت اور سالہا سال کی نیکی برباد ہو

---

[۱] کسی مسئلہ کا حکماً جواب۔

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے
عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

اب بھی آپا جان کی جو محبّت امّاں جان کو ہوگی مجھ کو اور آپ کو اُس کا ایک شمّہ ہو تو لے۔

بڑا بھائی۔ غرض جو کچھ ہو سے

میرے وحشت خانہ میں دستِ جنوں کی دھوم ہے
عافیت مقصود اور آسودگی معدوم ہے

بھائی بھائی یہی باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں رسُولن نامی لونڈی دوڑی آئی اور علیم سے کہا کہ "میاں پوچھتے ہیں میری بات کا جواب تم نے ہست نیست کچھ نہ دیا" رسولن کو تو علیم نے یہ کہہ کر رخصت کیا کہ تو چل کر کہہ کہ ابھی آتے ہیں، اور بڑے بھائی سے کہا کہ ابّا جان آپ کے منتظر بیٹھے ہیں، جائیے، کھڑے کھڑے ہو آئیے۔

بڑا بھائی۔ اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ میرا جانا اور چلا آنا ایک سرسری بات ہے تو میں اب تک جا کر کبھی کا چلا آیا ہوتا۔

منجھلا بھائی۔ آپ نے یہ کیونکر تجویز کر لیا کہ سرسری نہیں ہے؟

بڑا بھائی۔ خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا۔

منجھلا بھائی۔ بس شاید ابّا جان کو اتنی ہی بات آپ کے

---

[۱] جو تجھ پر ہر دم مہربانی کرے اگر ایک بار عمر میں اُس سے ظلم سرزد ہو جائے تو اُس کو تو معاف کر دے۔

منھ سے سننی منظور ہے۔

بڑا بھائی۔ ع ہر سخن[1] موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

منجھلا بھائی۔ مجھ کو حیرت ہے کہ آپ کو تردد کس بات کا ہے؟

بڑا بھائی۔ میں ان کے مزاج سے خائف اور اپنی عادت سے مجبور ہوں۔

منجھلا بھائی۔ لیکن جانے میں جس بات کا احتمال ہے، نہ جانے میں اُس کا تیقن ہے۔

بڑا بھائی۔ احتمال تم کو ہے، نہ مجھ کو، میں سمجھے ہوئے بیٹھا ہوں کہ بالاخانہ پر چڑھا اور آفت نازل ہوئی۔

منجھلا بھائی۔ میں زیادہ اصرار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہیئے سو کیجئے لیکن اتنا پھر کہے دیتا ہوں کہ اس کا انجام بخیر نہیں معلوم ہوتا۔

بڑا بھائی۔ ع "ہر چہ[2] بادا باد ما کشتی در آب انداختیم"

منجھلا بھائی۔ تو پھر میں ابا جان سے کہلائے بھیجتا ہوں؟

بڑا بھائی۔ یہ تم کو اختیار ہے۔ میں جب اُن کے بُلانے سے جانا لابُد نہیں سمجھتا تو اُن کے پوچھنے سے جواب دینے کو کب ضروری جانتا ہوں؟

---

[1] ہر بات اور نصیحت کا ایک موقع ہوتا ہے [2] جو کچھ ہونا ہے وہ ہو، اب ہم ناؤ پانی میں ڈال چکے۔

منجھلا بھائی مایوس ہوکر اُٹھا اور تھوڑی دُور جاکر پھر لوٹ آیا اور کہنے لگا کہ "میرا پانوٗں آگے نہیں پڑتا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہوں تو کیا کہوں۔ یہ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کا نہ جانا بڑی ہی خرابی برپا کرنے گا۔ نہیں معلوم اس وقت آپ کو کیا ہوگیا ہے، آپ جاتے اور اُن کی بات کو نہ مانتے۔ تاہم چنداں قباحت نہ تھی۔ لیکن نہ جانے میں بگاڑ کی ابتدا۔ فساد کا آغاز نافرمانی کا شروع آپ کی طرف سے ہوتا ہے۔ تمام دُنیا آپ کو اس کا الزام دے گی۔ اور سارا جہان آپ پر قصور عاید کرے گا۔ اور چونکہ میں اس کا نتیجہ سرتاسر آپ کے حق میں زبوں سمجھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری اس میں شرکت ہو۔ آپ کو جانا منظور نہیں تو بہتر ہوگا کہ آپ کسی دوسرے کے ہاتھ کہلا بھیجئے"۔

بڑا بھائی۔ لیکن مجھ سے اُنھوں نے پوچھا نہیں تو میں کیوں کہلا بھیجوں؟

منجھلا بھائی ایسا روکھا جواب سُن کر پھر چلا، بیچارہ عجب ضغطے[1] میں تھا کہ اِدھر باپ نے بتاکید پوچھ بھیجا ہے تو جواب میں کچھ ہاں، نہیں کہنا چاہیئے۔ اور چونکہ سمجھ چکا تھا کہ نہ جانا بھائی کی ہمیشہ ہمیشہ تباہی کا موجب ہوگا اندر سے جی نہیں مانتا تھا کہ اُس کی بربادی کی بات منہ سے نکالے۔ اسی گھبراہٹ میں دوڑا ہوا ماں کے پاس گیا اور کہا کہ امّاں جان غضب ہوا چاہتا ہے"۔

---

[1] کشمکش

ماں بیچاری، نعیمہ کے سوچ میں بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ کوٹھری میں فرش پر ایک حالت سے پڑے پڑے نعیمہ کو سارا دن گزرا۔ نہ تو اُس نے سر اٹھایا نہ کوئی چیز اُس کے منھ میں گئی۔ ماں نے گلوریاں خاصدان میں بھروا کر پاس رکھوا دی تھیں وہ بھی سب اُسی طرح رکھی رکھی سوکھا کیں پانی اور کھانے کا کیا مذکور۔ لڑکا گھڑی دو گھڑی تو چپکا رہا پھر اُس نے الگ رونا شروع کیا۔ سارا گھر اُس کو سنبھالتا تھا مگر اس نے تالو سے زبان نہ لگائی۔ بہتیرا نانی بہلا پھسلا کر دودھ دیتی مگر گود میں سے نکل نکل پڑتا تھا۔ نہ اُٹھے سکھ نہ بیٹھے چین۔ سب کو حیران کر مارا۔ دن تو خیر بُری بھلی طرح گزر بھی گیا۔ اب ؏

رات آئی تو یہ جانا کہ قیامت آئی

صالحہ کو جو بلوایا تھا تو ایک یوں ہی سا پیام کہلا بھیجا تھا وہاں سے جواب آیا کہ آج شام کو گھر میں مولوی صاحب کا وعظ ہے انشاء اللہ کل بڑے تڑکے نماز صبح پڑھ کر میں پہنچوں گی۔ اسی اضطراب میں میاں علیم نے جو ایک دم سے جا کر کہا کہ غضب ہوا چاہتا ہے ماں کا کلیجہ دھک سے ہو گیا اور سمجھی کہ نعیمہ کی خیر نہیں۔ گھبرا کر پوچھا کیا؟

بیٹا۔ بھائی جان کو ابّا جان چار گھڑی دن رہے سے بلا رہے ہیں یہ وقت ہو لئے آیا نہیں جاتے ہیں۔ مردانے میں پردہ کرا دوں آپ ذرا چل کر سمجھا دیجئے۔ شاید مان جائیں۔ میں تو کہہ کر تھک گیا۔

فہمیدہ کا یہ حال تھا کہ نعیمہ سے بدتر اُس کی کیفیت تھی۔ لوگوں کے

دکھانے کو دسترخوان پر بیٹھ تو گئی تھی مگر ایک دانہ حلق سے نہیں اُترا۔ جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی مُنھ جھٹلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بار بار کسی نہ کسی بہانے سے کوٹھری کے پاس جاتی۔ کواڑوں کے پاس کھڑی ہو ہو کر درازوں میں جھانکتی اور نعیمہ کے رونے کی آہٹ لیتی۔ گھر والوں میں سے جو سامنے آنکلتا اُس کو بھیجتی کہ جاؤ ہو سکے تو مناؤ۔ لیکن کسی کو اتنا جگہاؔ نہ تھا کہ کوٹھری کے اندر قدم رکھتا۔

بیدارا جس نے نعیمہ کو پالا تھا اور ہر طرح کا دعویٰ رکھتی تھی لڑکے کو لیکر دودھ پلوانے کے بہانے سے پاس جا کر بیٹھی۔ ابھی منھ سے بات بھی نہیں کہنے پائی تھی کہ نعیمہ نے ایک ایسی دولتی چلائی کہ بیدارا کئی لڑکنیاں کھا کر گیند کی طرح لڑکتی لڑکاتی باہر آ کر گری۔ خدا نے بڑی خیر کی کہ لڑکا نہا بچہ سمیت گود سے نکل پڑا ورنہ اتنی دُور میں نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جاتا بیدارا کی مدارات دیکھ کر پھر تو جس سے فہمیدہ کوٹھری میں جانے کا نام لیتی وہ کانوں پر ہاتھ دھرتی کہ نہ بیوی میری ہڈیوں میں تو خدا کی لاٹھی سہارنے کا بوتا نہیں ہے۔ چاہتے سب تھے کہ نعیمہ کو منائیں مگر کوٹھری میں جانے سے ایسا ڈرتے تھے کہ گویا اندر کالی ناگن بیٹھی ہے۔ پاؤں رکھا اور اس نے ڈس لیا۔ باہر اُس ذرا سے فتنے یعنی نعیمہ کے بچّے نے آفت توڑ رکھی تھی۔ اُگالدان، پاندان، سیٹیاں بجاتے۔ کنڈیاں کھڑکھڑاتے مگر اس عزیز کے کان پر جوں نہ چلتی تھی۔ گود میں لٹاؤ جھولے میں سُلاؤ

لہ حوصلہ۔ ہمت۔

کندھے لگاؤ۔ لئے لئے پھر مگر کسی طرح اس کو قرار نہ تھا۔ بے زبان بچہ مُنھ سے بولتا نہیں چالتا نہیں۔ برابر روئے جاتا ہے کوئی کیا جانے کہ اس کو کس بات کی تکلیف ہے۔ پہلے تو خیال ہوا کہ کہیں افیم تو نہیں تھوک دی۔ مسور برابر چھوڑ خاصی مٹر جتنی گولی دی مطلق اثر نہیں۔ جانا کہ شاید ہنسلی جاتی رہی۔ وہ بھی ملوائی اور دونا چلّایا۔ سمجھے کہ پیٹ میں درد ہے، دودھ میں سہاگہ گھس کر دیا پھر بھی نہ چپ ہوا آخر جب خوب ہلاک ہولیا تو ہار کر کوئی دو گھڑی دن رہے نانی کے کندھے لگ کر سو گیا۔ یہ بیچاری بھی دن بھر کی تھکی ماندی نہار مُنھ اس پر دل اداس طبیعت مغموم بُت کی طرح ایک دیوار سے لگی ہوئی بیٹھی اونگھ رہی تھی کہ پہلے صالحہ کا جواب آیا۔ اوپر سے میاں علیم، بھائی کا مژدہ لیکر پہنچے۔ سُن کر رہی سہی عقل بھی کھوئی گئی۔ تھوڑی دیر تک تو چپ سنّاٹے میں بیٹھی رہی۔ اس کے بعد اپنے آپے میں آئی۔ علیم سے کہا پھر بیٹا تم نے بڑے بھائی کو کچھ نہ سمجھایا؟

بیٹا۔ میں نے کتنا کتنا سمجھایا۔

ماں۔ نعیمہ کا حال تم نے کچھ سُنا؟

بیٹا۔ جی ہاں سُنا۔

ماں۔ بس خدا نے دونوں کو ایک سانچے میں ڈھالا ہے مجھ کو تو اُمید نہیں کہ کلیم راہ راست پر آئے۔ جب اُس کو خدا ہی کا خوف اور باپ ہی کا ڈر نہ ہوا تو بھلا میں کون بلا ہوں۔ یوں تم کہتے ہو چلو میں اپنی طرف سے کہہ سُن بہتیرا کچھ دوں گی۔

کیوں علیم! بھلا تمھارے نزدیک میری زیادتی تھی یا نعیمہ کی؟

بیٹا - میں نے مفصل حال تو سُنا نہیں - لیکن جس قدر سُنا اُس سے سرتاسر آپا کا قصور معلوم ہوتا ہے اور مجھ کو زیادہ تحقیقات کرنے کی ضرورت بھی نہیں - میں نے سُنتے کے ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ امّاں جان نے جب ایسی ہی سخت ضرورت سمجھی ہو گی تو آپا پر ہاتھ اٹھایا ہو گا -

ماں - علیم! کیا میں تم سے کہوں! خدا کی شان میں ایک ایک بے ادبی کر معاذاللہ، میں تو تھرّا اُٹھی کہ ایسا نہ ہو کہیں چھت گر پڑے اور جان جان کر - منع کرتے کرتے -

بیٹا - بیشک آپ نے مارا تو بہت واجب کیا - خیر آپا کا تو چنداں اندیشہ نہیں - آپ ہی غصہ اُتر جائے گا - بڑے بھائی کا بڑا کھٹکا ہے یہاں کل تک وارا نیارا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے -

ماں - دونوں ایک دوسرے کے قدم بر قدم ہیں - اس نعیمہ نے کیا وارا نیارا کرنے میں کچھ اٹھا رکھا ہے - سارا دن گزر گیا نہ پانی پیا، نہ کھانا کھایا، نہ بچّے کو دُودھ پلایا -

بیٹا - بچّے کو دُودھ نہیں پلایا - بھلا اُس بیچارے کا کیا قصور؟

ماں - بیدارا ایک دفعہ لے کر گئی تھی - بیچاری کے ایسی لات ماری کہ دیکھو صحنچی میں ہلدی تھوپے پڑی کراہ رہی ہے -

بیٹا - میں چلوں اور سمجھاؤں؟

ماں - نہ بیٹا، اپنی عزّت اپنے ہاتھ - تم گئے اور چھوٹے تو ہو ہی

جا بیجا کہہ بیٹھی تو ناحق تم کو بُرا لگے - کیا فائدہ -

بیٹا - جب وہ میری بڑی بہن ہیں تو مجھ کو اُن کا کہنا بُرا کیوں لگنے لگا۔

ماں - تو بھی، تمھارے جانے سے کچھ فائدہ نہیں - میں نے صالحہ کو بلوا بھیجا - وہ آئے گی تو اُس کو اپنے طور پر ٹھیک ٹھاک کر لے گی -

بیٹا - واقعی آپ نے خوب تجویز کی مگر اب رات ہو گئی، کب آئیں گی -

ماں - اُن کے ہاں اس وقت وعظ ہے - اس سبب سے اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ کل بڑے سویرے پہنچوں گی - خیر جُوں تُوں رات کٹ ہی جائے گی -

بیٹا - میں جا کر صالحہ کو لے آؤں اتنے میں آپ بھائی جان سے باتیں کیجئے -

ماں - ہاں بہتر تو ہو گا - میں نے اُس کو یہ حال کہلا نہیں بھیجا ورنہ وہ تو سُنتے کے ساتھ دَوڑی آتی -

غرض علیم تو صالحہ کو لینے گیا اور فہمیدہ پردا کروا، مردانے میں پہنچی، اتنی ہی دیر میں یہاں تاش کھیلنے شروع ہو گئے تھے - فہمیدہ جو گئی تو چاندنی پر تاش کے ورق بکھرے ہوئے پڑے تھے - فہمیدہ نے دیکھ کر کہا کہ آگ لگے - اس کھیل کو - کھیل نہ ہوا بلائے جان ہوا کہ رات کو بھی بند نہیں ہوتا -

بیٹا - نکمّا بیٹھا ہوا آدمی کچھ کرے یا نہ کرے - ع

بیکار مباش کچھ کیا کر

ماں۔ بیٹا خدا نہ کرے کہ تم نکمّے ہو۔ کرنے والا ہو تو کام بہتیرے۔ باپ نے تم کو کئی دفعہ بُلایا۔ نکمے تو تھے۔ تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ جاؤں سُن تو آؤں کیا کہتے ہیں؟

بیٹا۔ بس میں نے یہیں سے بیٹھے بیٹھے سُن لیا۔

ماں۔ کچھ نہ سُنا نہ سنایا۔ جاؤ ہو آؤ۔ اچھی بات نہیں۔

بیٹا۔ اچھی بات کیا نہیں؟ میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے۔

ماں۔ تم جانتے سہی۔ مگر جا کر سُن لینے میں بیٹا کچھ قباحت ہے؟

بیٹا۔ ؏ قباحت سی قباحت ہے خرابی سی خرابی ہے۔

ماں۔ میں بھی سُنوں۔

بیٹا۔ اب مجھی سے کہلواتی ہو۔ تم آپ سمجھ جاؤ۔

ماں۔ میں تو تمہاری پہیلی[1] نہیں سمجھتی۔

بیٹا۔ ایسی پہیلیاں[2] نعیمہ خوب بوجھتی ہے۔

ماں۔ خدا کسی کو ایسی الٹی سمجھ نہ دے جیسی نعیمہ کی ہے تم اُس کی زبان سے سنتے کہ خدا تک کا لحاظ اُس نے اٹھا دیا۔ نماز کو اٹھک بیٹھک خدا کی شان میں، توبہ توبہ، یہ کلمہ کہ کیسا خدا، بیدین سے بیدین بھی ایسی بات منہ سے نہیں نکالتا۔ ابھی ایک آفت گھر پر آچکی ہے کہ ایک چھوڑ تین[3] تین مُردے اسی گھر سے اٹھے۔ مگر خوف مطلق نہیں۔ ذرا سا ڈر نہیں

بیٹا۔ وَبا بھی ایک مرگِ انبوہ[4] تھا۔ اچھے بُرے سب ہی قسم کے لوگ مرے

---

[1] چیستان۔ ہیر پھیر کی بات [2] یہ جملہ طنزاً کہا [3] ایسی موتیں جن کا پرساں نہ ہو۔

ماں - تو کیا اچھوں کو مرتا دیکھ کر آدمی بُرا بن جائے؟

بیٹا - نہیں - میں تو یہ نہیں کہتا کہ بُرا ہونا اچھا ہے۔

ماں - اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہوگی کہ آدمی خدا کو نہ سمجھے

بیٹا - اچھی کہی، خدا کو خدا کون نہیں سمجھتا - نعیمہ کے منہ سے نہیں معلوم کیونکر ایک بات نکل گئی ہوگی؟

ماں - پھر تم کو باپ کے پاس جانے میں کیا تامل ہے؟

بیٹا - میں نے سُنا ہے کہ وہ نماز پڑھنے کا قول کراتے ہیں۔ کھیل کود کو منع کرتے ہیں۔

ماں - ابھی تو تم نے کہا کہ میں خدا کو خدا سمجھتا ہوں تو کیا نماز اس کا حکم نہیں؟

بیٹا - میں یہ بھی نہیں کہتا کہ نماز اُس کا حکم نہیں ہے لیکن مجھ سے ایسے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

ماں - تو تم نے یہ ناحق کہا کہ میں خدا کو خدا سمجھتا ہوں - اگر تم خدا کو خدا سمجھتے تو ضرور اُس کا حکم مانتے۔ چلو بیٹا دُنیا اور دین دونوں سے آزاد ہوئے - اِدھر باپ بُلائے اور نہ جاؤ تو گویا باپ کو نہ جانا۔ اُدھر خدا فرمائے اور نماز نہ پڑھو یعنی خدا کو خدا نہ سمجھا۔

بیٹا - مجھ کو حیرت ہے کہ گھر میں کیوں یہ نئے نئے دستور اور قاعدے جاری کئے جاتے ہیں - وہی خدا ہے اور وہی ہم سب ہیں تو جس طرح پہلے سے رہتے سہتے چلے آئے ہیں اب بھی رہنے دیں۔

دوسرے کے افعال سے کیا بحث اور کسی کے اعمال سے کیا سروکار۔ اگر کوئی بیدین ہے تو اپنے لئے اور کوئی زاہد اور پرہیزگار ہے تو اپنے واسطے۔

ماں۔ سروکار کیوں نہیں؟ اولاد کی تعلیم ماں باپ پر فرض ہے۔

بیٹا۔ پہلے سے فرض تھی یا اب علالت میں کوئی خاص وحی[1] نازل ہوئی ہے؟

ماں۔ اگر تم ایسی حقارت سے باپ کا ذکر کرتے ہو تو یہ تمھاری سعادتمندی کی دلیل ہے۔ تم تو کتابیں پڑھتے ہو؟ ماں باپ کا کیسا کچھ ادب لکھا ہے۔ لوگوں میں بھی اس کی ایک کہاوت مشہور ہے "با ادب بانصیب"، تمھارے باپ بیچارے نے تو ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مجھ کو الہام[2] ہوتا ہے یا مجھ پر آسمان سے وحی اُتری ہے۔

بیٹا۔ اگر وحی نہیں ہے تو اُسی علالت کا اثر ہے؟

ماں۔ تم باپ تک گئے ہوتے تو کبھی ایسے احتمالات نہ کرتے یہ تمھاری نئی تجویز نہیں تو کیا ابتدائے علالت سے باپ کو جنون اور سرسام بتاتے ہو لیکن کیا مجنون کا یہی کام ہے کہ عاقبت تک کی مآل اندیشی کرے۔ دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ آخرت تک کا انجام سوچیں۔ ایک مرتبہ ذرا کی ذرا چل کر اُن کی باتیں سُنو اور پھر اُن کو

[1] وہ حکم خدا جو پیغمبروں کی معرفت بندوں کو ملتا ہے [2] غیب کی خبریں جن میں پیغمبر کی قید نہ ہو۔

مجنوں سمجھو تو البتہ میں قائل ہو جاؤں گی۔

بیٹا۔ کیا میں بھی سلیم ہوں کہ اُن کی باتوں میں آجاؤں گا؟

ماں۔ ہماری نظروں میں تو تم سلیم سے بھی چھوٹے ہو۔

بیٹا۔ بس یہ مہربانی نعیمہ ہی کے ساتھ خاص رہے۔

ماں۔ اگر مہربانی ہی مہربانی ہوتی تو شاید تم کو اس کے کہنے کی نوبت بھی نہ آتی۔ کیونکہ مہربانی اُسی کے ساتھ کی جاتی ہے جو اس کی قدر کرے اور مہربانی کرنے والے کا احسان مانے۔ مجبوری تو یہی ہے کہ نری مہربانی نہیں ہے بلکہ اپنی گردن کا بوجھ اور اپنے سر کا فرض اُتارنا ہے۔

بیٹا۔ یہ نیا مسئلہ ہے کہ بڈھے طوطوں[1] کو مار مار کر پڑھایا جائے؟

ماں۔ تم اپنے تئیں بڈھا سمجھتے ہو؟

بیٹا۔ میں دودھ پیتا ہوا بے تمیز بچہ سہی لیکن میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے افعال سے تعرض کرے۔ میں اپنا بُرا بھلا آپ سمجھ سکتا ہوں۔

ماں۔ ماں باپ بھی اولاد کے بدخواہ نہیں ہوتے۔ ہم لوگ بھی تمھاری ہی بہتری کے لئے کہتے ہیں۔

بیٹا۔ مجھ کو اپنی بہتری منظور نہیں ہے۔

ماں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ بات تم اس وقت ضد سے کہہ رہے ہو

---

[1] مثل مشہور ہے۔ طوطا بچہ ہی پڑھ سکتا ہے۔ بڈھا طوطا نہیں پڑھتا۔ یہی کلیم کہتا ہے اب ہم اس قابل نہیں۔

بھلا دنیا میں کوئی بھی ایسا ہے جو اپنی بہتری نہیں چاہتا؟

بیٹا۔ جب میں تمھاری مداخلت اپنے افعال میں نہیں جائز رکھتا تو تم بیٹھے ٹھائے مجھ کو چھیڑنے والی کون؟

ماں۔ میں تمھاری ماں وہ تمھارے باپ۔

بیٹا۔ یہ بھی اچھی زبردستی ہے۔ مان نہ مان۔ میں تیرا مہمان۔ مجھ کو تمھارے ماں باپ ہونے سے انکار نہیں گفتگو اس بات میں ہے کہ تم کو میرے افعال میں زبردستی دخل دینے کا اختیار ہے یا نہیں؟ سو میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔ تم کہتی ہو کہ ہم بمجبوری دخل دیتے ہیں اس واسطے کہ ماں باپ پر اولاد کا تعلیم کرنا فرض ہے۔ سو اوّل تو میں اُس کو داخل تعلیم ہی نہیں سمجھتا۔ اور مانا کہ داخل تعلیم ہو بھی تو میرے نزدیک صرف دس بارہ برس کی عمر تک اولاد محتاج تعلیم ہے، اُس کے بعد ماں باپ کو اُن کی رائے میں کچھ دخل نہیں۔ وہ اپنا نفع ونقصان خود سمجھ سکتے ہیں۔ اگر یہی منظور تھا کہ میں بڑا ہو کر مسجد کا مُلّا نا یا قبرستان کا قرآن خوان یا لنگر خانہ خیراتی کا ٹکڑ گدا بنوں تو شروع سے مجھ کو ایسی ہی تعلیم کی ہوتی کہ اب تک بھلا کچھ نہیں تو میں دو چار حج بھی کر آیا ہوتا۔ پنج آیت میں میری قرأت[1] کی دھوم ہوتی۔ تراویح[2] میں میرے لحجہ قرآن خوانی کی شہرت اُڑتی۔ کہیں مُردہ مرتا۔ جائے نماز مجھ کو ملتی کہیں

[1] حرفوں کو صحیح مخرج سے ادا کرنا۔ ٹھیک تلفظ [2] ماہ رمضان میں نماز عشا کے بعد نماز نفل و قرآن شریف کی تلاوت۔

قربانی ہوتی کھال میرے پاس آتی ۔ صدقے کا میں آڑھتیا ہوتا ۔ زکوٰۃ کا ٹھیکہ دار، دعوتوں کا مستحق، خیرات کا حقدار ۔ نہ یہ کہ پڑھاؤ کچھ، پوچھو کچھ، سکھاؤ اور چیز اور امتحان لو دوسری چیز میں، دنیا میں جیسے اور شریف معزز خاندانوں کے بیٹے ہیں اگر میں سب میں اچھا نہیں تو کسی سے برا بھی نہیں ۔ مشاعرے میں میری غزل ساتھ کے مشق کرنے والوں میں سب سے بڑھی چڑھی ہوتی ہے ۔ شطرنج میں مرزا شاہ رُخ تو خیر پُرانے کھیلنے والوں میں ہیں اور حق یہ ہے کہ اچھی شطرنج کھیلتے ہیں دوسرا کوئی مجھ کو مات کر دے تو البتہ میں اُس کی ٹانگ تلے سے نکل جاؤں ہمارے محلے میں میاں وزیر بادشاہی پیادوں کے جمعدار بڑے شاطر دل میں مشہور ہیں ۔ میں فرزیں[1] اُٹھا کر اُن کے ساتھ کھیلتا ہوں ۔ گنجفہ اگرچہ میں کم کھیلتا ہوں لیکن بیٹھ جاؤں تو ایسا بھی نہیں کہ کوئی صفو پر[2] نادری چڑھائے اور قریب یہی حال تاش اور چوسر کا ہے ۔ کبوتر جیسے آج ہماری چھتری کے ڈنڈار[3] ہیں شہر میں شاید دو چار جگہ اور ہوں گے پتنگ میں ایسا اڑاتا ہوں کہ ایک ڈھیلچے سے دو ڈھڈے کی نکل[4] ایک نہیں تو سیکڑوں کاٹی ہوں گی ۔ لکھنے سے میں عاری نہیں ۔ پڑھنے سے میں عاجز نہیں ۔ میں نہیں جانتا کہ امیروں اور امیرزادوں کا وہ کون سا ہنر ہے جو مجھ کو نہیں آتا ۔

---

[1] گوٹیں ۔ (شطرنج کے کھیل کا ایک ڈھنگ) [2] اپنے پاس پتے ہوں اور دینے پڑیں یا یہ بھی گنجفہ کی ایک چال ہوتی ہے [3] اڈہ [4] بے تکان تا دیر اُڑنے والے ۔

قسمت سے تو ناچار ہوں اے ذوق وگرنہ

ہر فن میں ہوں میں طاق[1] مجھے کیا نہیں آتا

کل کی بات ہے کہ میری مدح ہوتی تھی اور مجھ کو ہر ہر بات پر شاباش ملتی تھی اب دفعۃً میں ایسا بے ہنر ہو گیا کہ مجھ کو سیکھنے اور تعلیم پانے کی ضرورت ہے ع

ہائے ہم کیا کہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر

میرا کون سا فعل ہے جو تم کو اور ابا جان کو معلوم نہیں کیا ابّا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں۔ میں اُن کے ہاتھ کے صاد[2] کیے ہوے دکھا سکتا ہوں۔ ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا کہ شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابا جان نے کسی اخبار میں دیکھا تھا۔ اُس کو میں نے حل کیا۔ کبوتر اڑتے تم نے نہیں دیکھے یا تپنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سُنی؟ کبھی تم نے روکا یا انھوں نے ٹوکا۔ اب یہ نئی بات البتہ سننے میں آتی ہے کہ نماز پڑھو۔ مسجد میں معتکف[3] بن کر بیٹھو۔ کھیلو مت۔ کسی یار آشنا سے ملو مت۔ بازار مت جاؤ۔ میلے تماشے میں مت شریک ہو۔ بھلا کوئی مجھ سے یہ باتیں ہونے والی ہیں ؎

جو دل قمار خانہ میں بُت سے لگا چکے

وہ کعبتین[4] چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

ماں۔ میں سچ کہتی ہوں کہ جتنی باتیں تم نے کہیں۔ تمھارے باپ

---

[1] ماہر [2] صحیح اور پسند [3] عابدِ گوشہ نشیں [4] جوئے کے پانسے۔

جن کو تم مجنوں اور مختل[1] الحواس تجویز کرتے ہو، سب سے پہلے سے سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں اور اُن کو معلوم ہے کہ تم سے ان عادتوں کا ترک ہونا دشوار ہے اور ابتدا میں تم کو تعلیم نہ کرنے کا تذکرہ کر کر کے اس قدر حسرت کے ساتھ روتے ہیں کہ دیکھنے والا تاب نہیں لا سکتا۔ غضب تو یہی ہے کہ تم اُن تک پہنچتے نہیں۔ ورنہ تم کو معلوم ہو جاتا کہ باپ کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ وہ خود قائل ہیں کہ اولاد کا کچھ قصور نہیں۔ اُن کے بگاڑ کا وبال اُن کی خرابی کا الزام سب میری گردن پر ہے" اپنے تئیں کوستے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میں ان کا باپ تھا یا عدو تھا کہ میں نے جان بوجھ کر ان کا ستیاناس کیا۔ دیدہ و دانستہ اُن کو غارت کیا۔ اب کس مُنھ سے اُن کو سمجھاؤں اور کیونکر اُن سے آنکھیں ملاؤں۔ مگر پھر آپ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں اب تک کوتاہی کی تو کیا تلافی مافات سے غافل رہنا ترک فرض سے کچھ کم ہے۔ ناچار اپنے مقدور بھر کوشش کروں گا۔ مجبوراً حتی الوسع زحمت اُٹھاؤں گا۔

بیٹا۔ خیر ایسا ہی فرض کا خیال ہے تو دوسرے بچّوں کو اپنی رائے کے مطابق تعلیم کریں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں۔

ماں۔ کیوں؟ کیا خدا نخواستہ تم اولاد میں نہیں ہو؟

بیٹا۔ ہوں۔ لیکن مجھ سے بھی آخر کہہ نہ چکے۔ بس اُن کے ذمّہ سے فرض ساقط ہو گیا۔

---

[1] جس کے حواس میں خلل ہو۔ دیوانہ

ماں۔ یہی حجت دوسرے بھی پیش کر سکتے ہیں؟

بیٹا۔ جھک مارنے کی بات ہے۔ چھوٹوں کو ماننا چاہیئے۔

ماں۔ کیا چھوٹے سدا چھوٹے ہی رہیں گے؟

بیٹا۔ بڑے ہوئے پیچھے بیشک اُن کو بھی آزادی ہونی چاہیئے۔

ماں۔ گھر میں اگر کوئی انتظام کرنا منظور ہو تو جب تک چھوٹے بڑے سب اُس کی تعمیل نہ کریں وہ انتظام چل نہیں سکتا۔

بیٹا۔ چلے یا نہ چلے۔ بی میں تم سے صاف کہوں مجھ سے تو یہ نماز روزے کا کھڑاگ سنبھلنے والا نہیں۔ یہ سر حاضر ہے۔ نعیمہ کی طرح چاہو مجھ کو بھی دو چار جوتیاں مار لو۔

ماں۔ آہی نماز کچھ ایسی مشکل ہے کہ جوتیاں کھانی قبول، پر نماز پڑھنی منظور نہیں؟

بیٹا۔ مجھ کو تو ایسی ہی مشکل معلوم ہوتی ہے۔

ماں۔ خیر تم میری اور باپ کی خاطر سے پڑھ لیا کرنا؟

بیٹا۔ مجھ سے ہو ہی نہیں سکتی۔

ماں۔ تو یوں کہو "تم کو باپ کے کہنے کی ضد ہے"؟

بیٹا۔ جو کچھ سمجھو۔

ماں۔ بھلا پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟

بیٹا۔ ہوگا کیا؟ بہت کریں گے خفا ہوں گے۔ دو چار دن میں سامنے نہ جاؤں گا۔ آخر تم کہہ سُن کر بات گورفت دگزشت کرا ہی دو گی۔

کیوں بی امّاں؟ کرادو گی نہ؟ ہماری امّاں جان نہیں؟

ماں - اگریہی انجام ہوتا تو میں تم سے اتنا اصرار ہرگز نہ کرتی۔

بیٹا - پھر کیا مجھے پھانسی دلوا دیں گے؟ مار ڈالیں گے۔ کیا کریں گے؟

ماں - بھلا بیٹا کوئی کسی کو مار سکتا ہے؟ ایک ذرا ہاتھ لگانے پر تو نعیمہ نے یہ آفت توڑ رکھی ہے۔ کہ اللہ پناہ دے۔ جان سے مارنا تو خدا کا گناہ اور حاکم کا جُرم۔

بیٹا - شاید یہ کریں کہ گھر سے نکال دیں۔

ماں - شاید۔ تم تو بیٹے ہو۔ اُن کو اس بلا کا اہتمام ہے کہ اگر میں بھی اُن کی رائے کے خلاف کروں تو تیئس برس کا گھر خاک میں ملانے کو تیّار ہیں۔

بیٹا - شاید اسی ڈر کے مارے تم سب کے سب اُنھیں کی سی کہنے لگے۔

ماں - اس وقت تک تو کسی کے ساتھ کسی طرح کی سختی کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ باتیں ہی وہ اس غضب کی کرتے ہیں کہ گنجایشِ انکار باقی نہیں رہتی۔ لیکن ہاں، جو تمھاری طرح کوئی کٹھ حجتّی کرتا تو ضرور بگڑتے۔

بیٹا - میں اُن کی خفگی سے تو خیر کسی قدر ڈرتا بھی تھا۔ لیکن گھر سے نکلنے کی تو بندۂ درگاہ ذرا بھی پروا نہیں کرتے اور گھر کی طمع سے جو نماز پڑھے میں اُس کو بھی کچھ کہتا ہوں۔ اپنے کھانے کپڑے پر گھمنڈ

کرتے ہوں گے۔ میں اُن جیسے دس کو کھانا کپڑا دے سکتا ہوں۔

ماں۔ باپ بیچارے نے تو یہ بات بھی منہ سے نہیں نکالی۔ تم اپنے دل سے جو چاہو سو کہو۔

بیٹا۔ نہیں اُن کے اصرار سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کپڑے کا ڈراوا دکھا کر وہ چاہتے ہیں کہ دین کا ٹوکرا زبردستی ہم لوگوں کے سر پر لادیں۔ سو یہ دل سے دُور رکھیں۔ میں خود گھر سے دل برداشتہ ہو رہا ہوں نہیں معلوم کیا سبب تھا کہ میں اب تک رہ گیا اگر پہلے سے ذرا بھی مجھ کو معلوم ہوا ہوتا تو خدا کی قسم کبھی کا گھر سے ایسا گیا ہوتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور اب دیکھ لینا " دیوانہ را ہوئے بس است "[1]

ماں۔ بیٹا! تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ باپ تک گئے نہیں نہ اپنی کہی نہ اُن کی سُنی۔ آپ ہی آپ تم نے ایک بات فرض کرلی اور اس پر غصّہ کرنے لگے۔

بیٹا۔ دُرست، چھیڑ چھاڑ میری طرف سے شروع ہوئی یا اُن کی طرف سے؟

ماں۔ اپنی بہتری کی بات کو تم نے چھیڑ چھاڑ سمجھا اور مانا کہ انھیں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی سہی تو تم کو گھر سے ناراض ہونے کا کیا سبب؟ گھر میں تو میں بھی ہوں۔ اللہ رکھے تمھارے بھائی ہیں، بہنیں ہیں۔ ہم سب نے تمھارا کیا قصور کیا؟

[1] باؤلے کے سامنے ذرا ہو، کردو۔ بس کافی ہے۔ اس کا جنون اور بڑھ جائے گا۔

بیٹا۔ تم سب تو اُنھیں سے ملے ہوئے ہو۔ اچھا اگر تم کو میرا پاس ہے تو میرا ساتھ دو۔

ماں۔ اگر تمھارے باپ کی زیادتی ہوتی تو بیشک میں تمھاری طرفداری کرتی۔ انسان وہ کام کرے کہ دس بھلے آدمیوں میں بات آپڑے تو لوگ اُس کو الزام نہ دیں۔ فرض کیا کہ تم اتنی ہی بات پر گھر سے خفا ہو کر چلے گئے تو لوگ تم کو قصوروار ٹھہرائیں گے۔

بیٹا۔ لوگ میرے قاضی نہیں، مفتی نہیں۔ میں کسی کی رعیّت نہیں۔ جب میں اپنے سگے باپ کے کہنے کی پروا نہیں کرتا تو لوگ پڑے بھونکا کریں۔

ماں۔ بیٹا! دنیا میں رہ کر تو ایسی آزادی نبھ نہیں سکتی۔

بیٹا۔ اجی۔ ایسی نبھے کہ جسے کہتے ہیں ؎

کیسا اس کو نباہتا ہوں

انشاء اللہ دیکھئے گا

ماں۔ کیا تم گھر سے چلے جاؤ گے؟

بیٹا۔ کوئی مجھ کو روک بھی سکتا ہے؟ ؎

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ماں۔ کیوں روکنے والی میں موجود بیٹھی ہوں کیا میرا تم پر اتنا بھی حق نہیں ہے؟

یہ کہہ کر فہمیدہ کا دل بھر آیا اور اُس پر رقت طاری ہو گئی۔

میں نے تم کو نو مہینے اسی دن کے واسطے پیٹ میں رکھا تھا؟ اور اسی لئے تمھارے پالنے کی مصیبتیں اٹھائی تھیں کہ جب بہار دیکھنے کے دن آئیں تو تم مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ کلیم! سچ کہتی ہوں، ذرا جا دیکھ قیامت تک تو دودھ بخشنے ہی کی نہیں۔

بیٹا۔ ع ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

ماں۔ بھلا ایسے جانے میں کیا فلاح و برکت ہوگی کہ باپ کو نارضامند کر کے جاؤ اور ماں کو ناخوش اور بے وجہ، بے سبب!

بیٹا۔ خیر اب تو یہی دل پر ٹھنی ہے۔ ع

سر جائے یہ درد سر نہ جائے

اور کچھ خاصکر یہی سبب نہیں۔ مدّتوں سے میرا دل گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا اور ہمیشہ خیال آیا کرتا تھا کہ چلوں ذرا باہر کی بھی ہوا کھاؤں۔

ع "چل درِ میکدہ تک ہے حرکت میں برکت"

ماں۔ گھر سے ناراض ہو کر جاؤ گے تو اچھا باپ دادا کا نام اُچھلے گا؟

بیٹا۔ جب باپ نے میرا پاس آبرو نہ کیا تو خاندان کی عزّت رہے تو بلا سے، اور جائے تو بلا سے۔

ماں۔ باپ دادوں کی عزّت تو رہے یا جائے۔ تم نے گھر سے باہر قدم رکھا اور تمھاری بات دو کوڑی کی ہوئی۔ یہی تمھارے دوست آشنا جو رات دن تمھاری تلو تپّو میں لگے رہتے ہیں، سلام تک کے روادار

۱؎ عاشقی میں جہاں اور غم ہیں، یہ بھی سہی ۲؎ خیال ۳؎ عربی کی مثل ہے۔ چل فائدہ ہوگا۔

تو ہونے ہی کے نہیں۔ ہمدردی اور غمگساری کا تو کیا مذکور ہے۔

بیٹا۔ گھر سے نکل کر کیا میں نے دلّی میں رہنے کی قسم کھائی ہے؟

ملکِ خدا تنگ نیست ۔ پائے مرا لنگ نیست[1]

جدھر کو منہ اُٹھ گیا چل کھڑے ہوئے۔

ماں۔ بھلا میں بھی تو سُنوں۔ کہ تم نے کون سا ٹھکانہ سوچا ہے؟

بیٹا۔ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ماں۔ بھلا پھر اس میں خوبی کیا نکلی کہ تم نے عیش چھوڑا، آرام چھوڑا۔ گھر چھوڑا۔ عزیز و اقارب چھوڑے اور ان سب کے بدلے ملا تو کیا ملا؟ بدنامی کا خلعت، رسوائی کا خطاب، مفلسی اور محتاجی کا انعام، تکلیف و مصیبت کا پروانہ۔ تردّد و پریشانی کا فرمان۔ موٹی سے موٹی سمجھ اور چھوٹی سے چھوٹی عقل بھی اس کو جائز نہیں رکھتی۔

بیٹا۔ عقل چہ کتّی[2] است کہ پیش مرداں بیاید۔

ماں۔ تم تو باپ کو باؤلا اور مجنوں بتاتے تھے؟ مگر باؤلوں کی سی باتیں۔ دیوانوں کی سی حرکتیں تم خود کرتے ہو۔ دیکھو کہے دیتی ہوں بہت پچھتاؤ گے۔ بہت افسوس کرو گے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم میری بات مانو لیکن جس کو تم اپنے نزدیک معقول پسند اور دانشمند سمجھتے ہو، اُس سے پوچھو۔

---

[1] نہ خدا کا ملک تنگ ہے نہ میں لنگڑا ہوں (کہ کہیں جا نہ سکوں) [2] یہ آوارہ لوگوں کی صحبت میں باتیں ہوتی ہیں کوئی مستند مثل نہیں ہے۔

صلاح لو۔ مشورہ کرو۔ دیکھو تو کیا کہتا ہے؟

بیٹا۔ ع رائے اپنی اصلاح ہے اپنی۔

ماں۔ بھلا اتنا تو تم سمجھو کہ میں جو تم سے اتنا اصرار کر رہی ہوں اور اتنی دیر سے تمھارے پیچھے سر کھپا رہی ہوں اس میں کچھ میرا نفع یا تمھارے باپ کا فائدہ ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو کچھ ہم کو بخش دو گے یا کور راہ چلو گے تو کچھ ہم سے چھین لو گے؟ مگر خدا نے یہ اولاد کی ممتا کمبخت ایسی ہمارے پیچھے لگا دی ہے کہ جی نہیں مانتا اور دل صبر نہیں کرتا کہ تم کو بگڑتے دیکھیں اور نہ روکیں۔ تم خرابی کے لچھن اختیار کرو اور ہم منع نہ کریں۔

ماں اور بیٹے میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بیدار اندر سے ایک خط لیے ہوئے نکلی اور وہ خط اُس نے لا، کلیم کے ہاتھ میں دیا۔ رات کا وقت اور بیدارا کا اندر سے لیکر نکلنا۔ فہمیدہ سمجھ گئی ضرور کلیم کے باپ کا خط ہے۔ جب تک کلیم خط پڑھتا رہا، فہمیدہ چپ بیٹھی دیکھا کی۔ خط پڑھ چکنے کے بعد کلیم چاہتا تھا کہ پھر وہی بات شروع کرے۔ اتنے میں فہمیدہ نے پوچھا: "باپ نے کیا لکھا ہے"؟

بیٹا۔ اُن کو تو جانتی ہو؟ جب بات کے پیچھے پڑتے ہیں تو پھر دل کی خبر لاتے ہیں۔ پھر بُلایا ہے۔

ماں۔ صرف بُلاوے کا اتنا بڑا بھاری خط ذرا میں بھی دیکھوں۔

فہمیدہ نے خط لے کر پڑھا تو اُس میں لکھا تھا۔

خط

اے جانِ پدر! اَرشدک اللہ تعالیٰ[1]

میں نے تم کو پہلے علیم اور پھر رسولن کے ہاتھ بلوایا اور تم نہ تو آئے اور نہ معذوری و معذرت کہلا بھیجی - جس سے ظاہر ہے کہ تم نے مجھ کو ہیچ اور میرے حکم کو بے وقعت محض سمجھا - اگرچہ میرے نزدیک دنیا کا ضروری سے ضروری کام بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ باپ بُلائے اور بیٹا کام کے حیلے سے باپ کے پاس حاضر ہونے میں تکث[2] کرے - لیکن اگر کوئی ضرورت ایسی درپیش تھی کہ تم اُس کو میری طلب پر مقدم رکھنا چاہتے تھے تو اس ضرورت کو مجھ پر ظاہر اور اپنی مجبوری سے مجھ کو مطمئن کرنا بھی تم پر لازم تھا - نہ صرف اس نظر سے کہ میں تمھارا باپ ہوں اور تم میرے بیٹے ہو بلکہ آدابِ تمدن[3] اور اخلاقِ معاشرت[4] اسی طرح کے برتاؤ کے مقتضی[5] ہیں - دُنیا کا انتظام جس قاعدے اور دستور سے چلتا ہے تم اپنے تئیں اُس سے بےخبر اور ناواقف نہیں کہہ سکتے - ہر گھر میں ایک مالک - ہر محلے میں ایک رئیس - ہر بازار میں ایک چودھری - ہر شہر میں ایک حاکم - ہر ملک میں ایک بادشاہ - ہر فوج میں ایک سپہ سالار - ہر کام کا ایک افسر، ہر فرقہ کا ایک سرگروہ ہوتا ہے - الغرض ہر گھر ایک چھوٹی سی سلطنت ہے اور جو شخص اُس گھر میں بڑا بوڑھا ہے وہ

---

[1] خدا تم کو نیک ہدایت کرے [2] دیر۔ سُستی [3] میل جول کا ادب [4] میل ملاپ کے قاعدے [5] خواستگار۔

اُس میں بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور گھر کے دوسرے لوگ بطور رعایا
اُس کے محکوم ہیں۔ اگر ملک کی بدنظمی۔ حاکم ملک کی غفلت اور بے عنوانی
سے ہوتی ہے تو ضرور اس گھر میں جو خرابی ہے اُس کا الزام مجھ پر ہے
اور میں نہایت ندامت اور حسرت کے ساتھ تسلیم[1] کرتا ہوں کہ اب تک
میں بہت ہی غافل بادشاہ اور بڑا ہی بے خبر حاکم رہا ہوں۔ میری غفلت
نے میرے ملک کو غارت اور میری سلطنت کو تباہ کر دیا۔ میری بے خبری
نے نہ صرف مجھ کو ضعیف الاختیار[2] بنایا بلکہ رعیت کو بھی ایسا سقیم الحال[3]
کر دیا کہ اب اُن کے پنپنے کی امید نہیں۔ جس طرح چھوٹے چھوٹے نواب
اور رجواڑے سلطانِ وقت کے حضور میں اپنے ملکوں کی بدنظمی کے واسطے
جوابدہی کیا کرتے ہیں اور اُن کو غفلت اور بے عنوانی کی سزا ملتی ہے۔
واجد علی شاہ سے سلطنت منتزع[4] ہوئی۔ والیِ ٹونک مسند حکومت سے
اُتار دیے گئے۔ میں بھی بادشاہ دوجہاں کے حضور میں اپنے گھر کی خرابی
کا جواب دہ ہوں اور دوسروں کو سزایاب ہوتے دیکھ کر اب مجھ کو سچا اور
پورا تنبہ[5] ہوا ہے اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے میری
خانہ داری کے ملک میں جتنے رخنے ہیں بند اور جتنے خلل ہیں مسدود۔
جتنے نقص ہیں پورے۔ جتنے سقم ہیں دفع کیے جائیں۔ بڑی خطرناک
قباحت جو میں اپنے ملک خانہ داری میں پاتا ہوں۔ یہ ہے کہ میں اور میری
رعایا یعنی تم لوگ شاہنشاہ دوجہاں سے سرکشی و بغاوت پر آمادہ و کمربستہ ہو

[1] قبول [2] کمزور اختیارات رکھنے والا [3] تباہ حال [4] نکل گئی [5] معلوم

اور خراجِ عبادت جو ہم کو وقت مقرر پر ادا کرنا چاہیئے بالکل باقی پڑا ہے۔ خراج جو ہم پر عائد کیا گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں تو نہایت ہی ہلکا اور نرم اور رعایتی ہے۔ اگر ہم چاہتے تو کوئی قسط بھی باقی نہ رہتی اور تو مطالبۂ شاہی تھا بے زحمت اپنے وقت پر خزانۂ عامرۂ سرکاری میں داخل ہو جایا کرتا۔ بایں ہمہ جو کوتاہی ہماری طرف سے ہوئی ظاہر ہے۔ اس نادہندی کی کوئی معقول تاویل بھی تو ہم نہیں کر سکتے۔ اب دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو پچھلا خراج تمام دکمال بیباق کریں اور اپنا قصور معاف کرائیں اور آئندہ کو عہد کریں کہ کبھی باقی نہ رکھیں گے یا بادشاہ کے ساتھ لڑیں اور مقابلہ کریں اور ہو سکے تو اپنے تئیں اُس کے ربقۂ[1] اطاعت سے آزاد کرلیں۔ شاہی قوّت اور ہمارا ضعف تو ظاہر ہے۔ بھلا ہماری تو کیا ہستی ہے فرعون[2] اور نمرود اور شدّاد اور ہامان اور قارون کیسے کیسے جابر اور مقتدر ہو گزرے ہیں باغی ہوئے تو کسی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ پس سوائے اطاعت و انقیاد[3] دوسرا چارہ نہیں۔ رعایائے ملک میں تم کو سربرآوردہ اور ممتاز سمجھ کر صلاح و مشورے کے لئے بلایا تھا۔ تمہارے نہ آنے سے ثابت ہوا کہ تم کو سرکار کا ذرا بھی خوف نہیں۔ اب تک میں نے تشبیہ و تمثیل میں تم سے گفتگو کی اور اس سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس مجبوری سے میں تمہارے معاملات میں دخل دیتا اور تمہارے افعال سے تعرّض کرتا ہوں۔ میرا دخل و تعرّض بیشک تم کو دخل بیجا اور

---

[1] حلقہ [2] بڑے بڑے سرکش کافر بادشاہوں کے نام ہیں [3] فرمانبرداری۔

تعرض ناروا معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن ذرا اپنی اور میری ذمہ داری کو انصاف
کے ساتھ موازنہ کروگے تو سمجھ لوگے کہ اس کو بیجا اور ناروا سمجھنا بڑی غلطی
ہے، جن شرطوں کا میں تم کو پابند کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے تئیں اور
کسی کے تئیں اُن سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔ پھر شکایت کیا اور گلہ کیوں! تم جیسے
نوجوان آدمیوں کو مذہب کے بارے میں کبھی کبھی خدشات بھی واقع ہوا کرتے
ہیں۔ اور یہ کچھ عیب کی بات نہیں، خدشے کا واقع ہونا دلیل جستجو ہے اور جستجو کا
انجام ہے حصولؔ "جوئندہ یابندہ[1]" اگر تم میں سے کوئی ایسا خدشہ پیش کرنا
چاہے تو میں اُس کا جواب دینے کو موجود ہوں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں
مذہب کے اصول ایسے سچّے اور یقینی اور بدیہی اصول ہیں کہ اُن میں
تردد وانکار کا مدخل ہو ہی نہیں سکتا۔ چونکہ ابتدائے شعور سے
اب تک ہم لوگ غفلت اور سستی اور بے پروائی اور خداوند جل علاشانہٗ[2]
کی مخالفت اور عدول حکمی اور نافرمانی میں زندگی بسر کرتے رہے اور
گناہ اور خطاکاری کی عادتیں ہمارے دلوں میں راسخ ہوگئی ہیں۔ البتہ
میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ ایک مدّت میں زنگ معصیت ہمارے
سینوں سے دور ہو کر یہ آئینۂ ایمان کی جلا سے منور ہوں گے لیکن بالفعل
میرا مطلب اسی قدر تھا کہ ہر شخص مناسب حالت اپنا اپنا فکر کر چلے۔
جب میں اپنی اور تم سب کی پچھلی زندگی پر نظر کرتا ہوں تو اپنی بوٹیاں توڑ توڑ کر
کھاتا ہوں کیونکہ اس ساری خرابی کا بانی اور اس تمامتر بدی کا موجد میں ہوں

[1] ڈھونڈھنے والا پانیوالا [2] اللہ کی شان بزرگ اور بڑی ہے۔

اے کاش! میرا اتنا ہی قصور ہوتا کہ میں اپنی ذات سے گنہگار قرار دیا جاتا۔ نہیں، تم سب کے گناہوں میں میرا ساجھا اور تم سب کی خطاؤں میں میری شرکت ہے۔ میں خدا کا گنہگار الگ ہوں اور تمہارا قصوردار الگ لیکن افسوس ہے کہ اس گناہ کا کفارہ اور اس قصور کی تلافی میرے اختیار سے خارج ہے۔ ہاں مگر یہ کہ تم مجھ پر رحم کرکے اپنی اصلاحِ وضع کر دو۔ کیا تمہاری سعادتمندی اس بات کو پسند کرتی ہے کہ تمہاری وجہ سے حشر کے دن میں خدا کے غضب میں پکڑا جاؤں۔ چونکہ تم میرے بڑے بیٹے ہو مجھ کو سب سے زیادہ تمہارا بھروسا تھا کہ تم اس مشکل میں میرا ساتھ دوگے، میری مدد کروگے، نہ کہ تم نے ملنے سے بھی کنارہ کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میری آس ٹوٹ گئی۔ اور میرے ذہنی منصوبے تمام بگڑ گئے اتنی بڑی مہم اور میں اکیلا۔ اتنا مشکل کام اور میں تنہا۔ تم جانتے ہو کہ تمہارا انحراف میرے انتظام میں کتنا خلل ڈالے گا؟ چھوٹے بڑے سب تم کو سند گردانیں گے اور بات بات میں تمہارا حوالہ دیں گے اگر تم اسی مصلحت سے میری شرائط کو قبول کر لیتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا؟ تم نے ابتدا ہی سے وہ سختی اختیار کی جس کی مجھ کو انجام میں بھی تم سے توقع نہ تھی۔ جتنی مشکلیں مجھ کو پیش آنے والی ہیں، میں ان سے بیخبر نہیں ہوں اور اگر اس ارادے کا ترک کر دینا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم سے سچ کہتا ہوں میں اس بات کو مُنھ ہی سے نہ نکالتا۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میں کوئی انوکھا آدمی نہیں ہوں آخر مجھ کو

ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ ابھی جب میں نے ہیضہ کیا تو کیا مرنے میں کچھ باقی رہ گیا تھا۔ خدا کی قدرت تھی کہ اُس نے مجھ کو از سر نو پھر جلا دیا۔ لیکن بکرے[1] کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی ؎

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر آخر کو مرنا ہے حضرت سلامت

اور جس طرح مرنا یقینی ہے، یہ بھی یقینی ہے کہ مجھ کو اپنے اعمال و افعال کے واسطے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور نہ صرف اپنے اعمال و افعال کے واسطے بلکہ تم سب کے اعمال و افعال کے واسطے بھی۔ پس سوائے اس کے کہ میں اپنا اور تم سب کا طرز زندگی بدل دوں اور کچھ چارہ نہیں۔ اگر تم میرے پاس آئے ہوتے اور مجھ سے اور تم سے بات چیت ہوئی ہوتی تو میں تمھاری رائے دریافت کر کے ایک خاص طور پر تم سے گفتگو کرتا۔ اب مجھ کو معلوم نہیں۔ جتنی باتیں میں نے کہیں ان میں کون سی تم کو تسلیم ہے اور کس کس سے تم کو انکار ہے۔ بس اب زیادہ لکھنا میں فضول و عبث سمجھتا ہوں لیکن جو کچھ میرے ذہن میں تھا لکھ چکا۔ میں تم سے اس کے جواب کا متقاضی نہیں اور اس کے دو سبب ہیں۔

اوّل یہ کہ میں اپنے تقاضہ کا لاحاصل اور بے اثر ہونا دیکھ نہیں سکتا۔

دوسرے صرف ایک ہی جواب ہے کہ اُس کو میں بطیب[2] خاطر

[1] یعنی مرنا کبھی نہ کبھی ضرور ہے [2] خوشی سے

سُن سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم میری شرطوں کو منظور کرو ورنہ میں اپنے تئیں مواخذۂ عاقبت سے بچانے کے لئے البتہ ان چند روزہ رشتوں کا پاس اور ان عارضی قرابتوں کی پروا نہیں کر سکتا اور یہ میری ہارے درجے کی تدبیر ہے اور میں خدا سے گڑگڑا گڑگڑا کر دُعا مانگتا ہوں کہ مجھ کو اس کے اختیار کرنے کی ضرورت واقع نہ ہو۔ والدُعا

خط پڑھ کر فہمیدہ بیٹے سے کہنے لگی۔ "دیکھا"؟

بیٹا۔ ع جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

ماں۔ کیا اب بھی تم کو باپ کی نسبت جنون کا احتمال ہے؟

بیٹا۔ احتمال کیسا؟ اب تو یقین کامل ہے۔ بقول شخصے ع

"دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں"

اپنے تئیں بادشاہ سمجھنا جنون نہیں تو کیا ہے؟

ماں۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ"[1]

بیٹا۔ کیوں، آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ کس بات پر کہا؟

ماں۔ تمھاری اُلٹی سمجھ اور تمھاری بدقسمتی پر۔

بیٹا۔ ع بہتر ہے وہی جو کچھ بدی[2] ہے۔

ماں۔ تو کیا سچ مچ تم باپ کے پاس نہیں جاؤ گے؟

بیٹا۔ اب تو میرا نہ جانا اُن پر بھی ظاہر ہو گیا۔ پھر کیا ضرورت ہے؟

---

[1] ہم خدا کے ہیں اور ہم کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ آیت کسی صدمہ اور افسوس کے موقع پر پڑھتے ہیں [2] نوشتۂ تقدیر۔

کل جیسی ہوگی دیکھی جائے گی۔

ماں۔ دیکھو پھر میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ رات کو اطمینان سے تم اس خط کے مطلب پر غور کرو۔ تمھارے باپ نے کوئی بات بیجا نہیں لکھی، جو شخص اس خط کو دیکھے گا تم ہی کو قائل معقول کرے گا۔

08

فصل ہشتم

نعیمہ کی خالہ زاد بہن صالحہ نے اُس کو آکر منایا کھانا کِھلایا اور اُسی کے ساتھ نعیمہ خالہ کے یہاں چلی گئی

ابھی فہمیدہ یہ بات پوری بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ صالحہ کی ڈولی آ پہنچی۔ اُترنے کے ساتھ خالہ سے پہلے ہی پوچھا، کہو آپا نے کچھ کھایا، پیا، یا نہیں؟

خالہ - کچھ بھی نہیں۔

صالحہ - ہیں کہاں؟

خالہ - درے کے اندر کوٹھری میں۔

صالحہ - آخر بات کیا ہوئی تھی؟

خالہ - کیا علیم نے تم سے کچھ نہیں کہا؟

صالحہ - اتنا ہی کہا کہ لڑائی ہوئی ہے۔ صبح سے کھانا نہیں کھایا۔ میں ہر چند پوچھتی رہی کچھ نہیں بتایا اور کہا کہ "بھائی وہیں چل کر پوچھ لینا۔" تب خالہ نے شروع سے آخر تک سب ماجرا کہہ سنایا۔ صالحہ بڑی

دانشمند لڑکی تھی اور اگرچہ نعیمہ سے عمر میں کچھ چھوٹی تھی مگر دونوں میں
بڑا ہی میل ملاپ تھا۔ صالحہ کو جو دقت پیش آنے والی تھی اس کو سوچ
سمجھ کر اُس نے خالہ سے کہا کہ "انشاء اللہ آپا کو میں راضی کر لوں گی۔
مگر میرے سوائے اُس مکان میں دوسرا آدمی کوئی نہ رہے کیونکہ گھر میں
جتنے آدمی ہیں آخر سب اس حال سے واقف ہیں۔ ان میں سے کوئی
سامنے جائے گا تو آپا کو ضرور حجاب ہوگا۔ بات صالحہ نے معقول سوچی
تھی کیونکہ جب ایک مجمع میں کسی آدمی کی بے عزتی ہوتی ہے تو جو لوگ
اُس کی تفضیح دیکھ چکے ہیں وہ سب کو اپنا دشمن ٹھہرا لیتا ہے۔ شاید اس
خیال سے کہ یہ سب کھڑے دیکھتے رہے اور انھوں نے میری کچھ مدد نہ کی
اور ان میں سے جب کوئی شخص سامنے آتا ہے تو اُس ستم رسیدہ کو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسی نے مجھ کو فضیحت کرایا تھا۔ پس ضرور اُس کے
غصّے کو ترقی اور اُس کے غضب کو زیادتی ہوتی ہے اور بیچاری بیدارا
نے جو ناحق ایک دولتّی کھائی تو اسی وجہ سے ورنہ اُس کا کیا قصور تھا۔
وہ ماں بیٹیوں کے بیچ میں کچھ بولی نہیں چالی نہیں۔ نہ کسی طرح کا دخل
دیا۔ نہ کسی کی طرفداری کی اور دخل دینے کی فرصت کس کو ملی۔ ماں
بیٹیوں میں ایک بات پر رد و کد ہونی شروع ہوئی۔ جیسے ہمیشہ ہوا کرتی
تھی۔ ماں نے دفعتاً بیٹی کو طمانچہ کھینچ مارا۔ غرض بات کی بات میں تو
تیاری سامان ارادے چڑھائی مار کٹائی۔ ہار جیت سب کچھ ہو گیا۔ گھر والے
دیکھنے کے دیکھتے ہی رہے۔ صالحہ نے جو اپنا انتظام خالہ کو سنایا۔

انھوں نے بھی پسند کیا اور سب لوگوں سے کہہ دیا کہ اُس قطعے میں کوئی نہ جائے ہر ایک کو سونے بیٹھنے کا ٹھکانا بتا دیا اور اپنے واسطے یہ تجویز کی کہ ہم گھر والے سب مردانے میں پردہ کرا کے سو رہیں گے بلکہ صالحہ نے کہا بھی کہ آپ کوٹھے پر سوئیں۔ خالہ نے جواب دیا کہ ابھی مجھ کو اُن بڑے حضرت میاں کلیم کے ساتھ سر مارنا ہے۔

صالحہ ۔ کیا ان سے بھی لڑائی ہوئی ہے؟

خالہ ۔ لڑائی کیسی اُن سے تو جھٹّم جھٹّا ہو رہی ہے۔

صالحہ ۔ کس بات پر؟

خالہ ۔ بات تو اتنی ہی ہے کہ باپ نے اُن کو نماز روزے کے واسطے نصیحت کرنے کو اپنے پاس اوپر بُلوایا۔ یہ نہیں گئے۔

صالحہ ۔ خالو جان نے بُلوایا، اور نہیں گئے؟

خالہ ۔ تم کو نہ جانے پر تعجب ہوتا ہے۔ باتیں سُنو تو حیران ہو جاؤ باپ کو دیوانہ اور مجنوں۔ نماز کو گھڑاگ۔ دین کے پیشواؤں کو مُلّا نے قلاؤزیے۔ مردہ شو۔ ٹکڑگدے۔ بھک منگے بتایا۔

صالحہ ۔ کسی نے آپ سے غلط کہہ دیا ہوگا۔

خالہ ۔ میرے رُو در رُو۔

صالحہ ۔ پھر کسی سے ان کو سمجھوا دیا ہوتا۔

خالہ ۔ ایک سمجھانا۔ علیم نے بہتیرا سر مارا۔ میں شام سے اب تک

لہ علیحدگی

کہتے کہتے تھک گئی۔ جن مصیبتوں سے آج کا دن کٹا ہے، خدا ہی جانتا ہے۔ دانہ تک میرے یا حمیدہ کے منھ میں گیا ہو تو جس طرح کی چاہو قسم لے لو۔ اُس پر نعیمہ کا فکر کلیم کا تردد اور سب سے بڑھ کر نعیمہ کے بچے کا سنبھالنا کہ آج اُس کو دن بھر روتے گزرا ہے۔

صالحہ۔ آپ کھانا کھائیے۔ دوسرا وقت بھی ناوقت ہو گیا یقین ہے کہ آپ کے کھاتے کھاتے میں آپا کے واسطے کھانا منگواتی ہوں۔

خالہ۔ میری کیا جلدی ہے میں کھا ہی لوں گی۔ حمیدہ بیچاری کے صبر کو دیکھو کہ اُس نے کھانے کا نام بھی تو نہیں لیا۔ کل اسی وقت کا کھائے ہوئے ہے۔ خالی پیٹ میں دن بھر پانی انڈیلتی رہی ہے میں نے ہر چند کہا۔ نہ مانا۔ آخر بھوکی سو رہی۔

صالحہ۔ کیا آپ حمیدہ پر بھی کچھ خفا ہوئی تھیں؟

خالہ۔ مطلق نہیں۔ اُس نے بہن کے افسوس میں کھانا نہیں کھایا۔ بہن کا وہ حال کہ بس چلے تو جان سے مار ڈالنے میں بھی تامل نہیں اور اس کی یہ کیفیت کہ بہن پر اپنا دم دیتی ہے۔ بھانجے کو اس قدر چاہتی ہے کہ رات کو بھی تو ساتھ لیکر سوتی ہے۔

صالحہ۔ حمیدہ کو آپ جگائیے اور اطمینان سے آپ بھی کھانا کھائیے اور اس کو بھی کھلائیے۔ آپا کا اب کچھ فکر نہ کیجئے۔

یہ کہہ کر صالحہ اندر مکان میں گھستے ہی پکاری کیوں بی میری آپا کہاں ہیں؟ گھر میں کوئی ہو تو جواب دے۔ سب سے پہلے باورچی خانہ میں

گئی وہاں نہ دیکھا۔ دالان میں آئی، وہاں بھی نہ پایا تو سہ درے میں ڈھونڈتی پھری۔ غرض ٹال مٹول کرتے کرتے آخر کار درے والی کوٹھری کے پاس آکر جھانکنے لگی۔ جہاں نعیمہ تھی۔

نعیمہ دن بھر تو فرش پر پڑی رہی مگر صالحہ کی آواز سنتے کے ساتھ جلدی سے اُٹھ، منھ لپیٹ، پلنگ پر جا لیٹی۔ اور دروازے کی طرف پیٹھ کر لی۔ صالحہ نے پہلے تو انجان بن کر پوچھا "یہ پلنگ پر کون لیٹا ہے۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگی اہا آپا ہیں۔ ایں اکیلی کوٹھری میں اور ایسے سویرے؟ اتنا کہا اور دوڑ کر نعیمہ کو پٹ گئی۔

نعیمہ نے جب سے صالحہ کی آواز سُنی اُس کو ایک طرح کی حیرت تھی کہ سان نہ گمان۔ دفعتہً یہ کہاں آموجود ہوئیں۔ مگر یہ بات اُس کے ذہن میں بھی نہیں گزری کہ بُلوائی ہوئی آئی ہے۔ نعیمہ نے اُس وقت اپنے تئیں ایسا بنا لیا کہ گویا دیر سے پڑی سوتی ہے اور بھاری سی آواز بنا کر بولی، اے ہے بھائی! ہم کو دق نہ کرو سونے دو۔

صالحہ۔ اے بی آپا، میں ہوں صالحہ۔ اٹھو منھ کھولو۔ ابھی سے کیوں سو رہیں؟ جی کیسا ہے؟

اگرچہ نعیمہ نے چاہا تھا کہ صالحہ پر اپنی کیفیت ظاہر نہ کرے مگر اس نے ایسی ہمدردی سے پوچھا کہ نعیمہ ضبط نہ کر سکی اور رونے لگی۔ اُس کو روتا دیکھ صالحہ نے اور اصرار سے پوچھنا شروع کیا، کیا سر دُکھتا ہے۔ پیٹ میں درد ہے۔ بچے کا جی کیسا ہے؟ سُسرال

والوں نے کچھ کہلا بھیجا ہے۔ گھر میں کسی سے لڑائی ہوئی ہے۔ صالحہ بہتیرا پوچھتی تھی مگر نعیمہ ہاتھوں سے پرے کو ڈھکیلتی جاتی تھی۔ اور کچھ جواب نہیں دیتی تھی۔ آخر صالحہ نے کہا "نہ بتاؤ تو مجھی کو کھاؤ" تب نعیمہ خفا ہو کر بولی "چل مکّارہ مجھی سے باتیں بنانے آئی ہے، کیا تجھ کو خبر نہیں؟

صالحہ۔ ابھی مولوی ہدایت اللہ صاحب کے وعظ سے اُٹھی چلی آتی ہوں۔ یہاں آئی تو خالہ اماں اور گھر والے سب مردانے مکان میں ہیں۔ اتنا سُنا کہ بڑے بھائی خفا ہو کر گھر سے جا رہے ہیں۔ مجھ کو تم سے ملنے کی جلدی تھی۔ خالہ اماں کو سلام کر سیدھی اندر چلی آئی یہاں آ کر دیکھا تو نہ آدمی نہ آدم زاد۔ تم کو سارے گھر میں ڈھونڈتی پڑی پھری۔

نعیمہ۔ کیوں بڑے بھائی کس بات پر گھر سے نکل رہے ہیں؟

صالحہ۔ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ خالو ابا نے کہلا بھیجا ہے کہ نماز پڑھیں تو میرے گھر میں رہیں ورنہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔

نعیمہ۔ آگ لگے اس نماز کو یہ کیا اب گھر میں کسی کو تھوڑا ہی رہنے دے گی۔ یہ تو حمیدہ کے سوائے سب ہی کو نکلوا دے گی۔

صالحہ۔ تو کیا آپا تم بڑے بھائی ہی کے واسطے پڑی رو رہی تھیں؟

نعیمہ۔ مجھ کو تو بیچارے بڑے بھائی کی خبر بھی نہیں۔ اُن سے پہلے میں آپ نکلنے کو بیٹھی ہوں۔

صالحہ۔ توبہ، آپا، توبہ، کیسی بدفال منہ سے نکالتی ہو کہ خدا

پناہ میں رکھے۔ اللہ کرے کہ کسی بھلے مانس اشراف کی بہو بیٹی گھر سے نکلے۔

نعیمہ۔ جب سے اس نماز روزے کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ہے بھلمنساہٹ اور شرافت سب گئی گزری ہوئی۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر ہر ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا۔ نہ وہ زمین رہی نہ وہ آسمان گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل سا گیا ہے۔ نہ وہ ہنسی ہے نہ وہ دل لگی ہے۔ نہ وہ چرچے ہیں نہ وہ مذاق ہے۔ نہ وہ چہچہے ہیں۔ گھر میں ایک اداسی چھائی رہتی ہے ورنہ ابھی ایک مہینے کا مذکور ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہا کرتی تھیں۔ کوئی گیت گا رہی ہے کوئی کہانی کہہ رہی ہے۔ یہ ہمسائی عجوبہ کچھ اس طرح کی زندہ دل ہیں کہ ہر روز نئی نئی نقلیں کر کے سب کو ہنساتے ہنساتے لٹا لٹا دیتی تھیں۔ اب کوئی گھر میں آکر تھوکتا بھی نہیں، گھر ہے کہ کمبخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے۔

صالحہ۔ آخر اس کا سبب کیا؟

نعیمہ۔ سبب تمھاری خالہ جان اور حمیدہ کے ابا جان کی بدمزاجی کسی کو کیا غرض، کیا مطلب؟ کہ اپنے کام کاج کا حرج کرے اور پرائے گھر آکر بیٹھے۔ کیا لوگوں کے گھروں میں بیٹھنے کی جگہ نہیں؟ لوگوں کی خاطر داری ہوتی تھی۔ محبت سے اُن کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ لوگ دوڑے آتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر وقت منہ کپّے کی طرح پھولا رہتا ہے

غیر آدمی کیوں برداشت کرنے لگے۔ سب کے سب چلتے پھرتے نظر آئے۔
ابا جان کے اچھے ہونے پر ڈومنیوں نے سیکڑوں ہی پھیرے کئے، سب ہی
نے کہا، ہمسائی عجوبہ نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے۔ ایک نہ مانی۔ آخر
وہ رتجگا تو خاک بھی نہ ہوا۔ نگوڑے۔ مسجد کے ملّانوں کو بلا کر کھلا دیا۔ اب تو
بُوا دن رات نماز کا وظیفہ ہے۔ وہ دیکھو تخت پر ہر وقت نماز کا چھیتھڑا[1]
بچھا رہتا ہے۔ وضو کا کلھڑا[2] کیا مجال کہ کسی وقت پاس سے الگ
ہو جائے۔ کام کاج سے فارغ ہوئیں تو یا نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں یا کتاب
پڑھنے بیٹھ گئیں۔ ایک حمیدہ کٹنی اُن کو ایسی مل گئی ہے کہ اور اُن کو
اکسایا کرتی ہے۔ میرا بس چلے تو کُتیا کو ایسا ماروں ایسا ماروں
کہ یاد کرے۔

صالحہ۔ اے ہے حمیدہ تو نگوڑی ایسی غریب اور بھولی لڑکی ہے
کہ میں نے تو آج تک کوئی اُس کی شرارت کی بات دیکھی کیا سُنی بھی نہیں
اور تم کو تو اتنا چاہتی ہے کہ کاہے کو کوئی بہن کسی بہن کو چاہے گی
رمضان کی بات مجھ کو اب تک نہیں بھولی۔ تم کو تو یاد ہوگا کہ اخیر عشرے
میں میں نے اُس کو بُلوا بھیجا تھا۔ گھر میں سب ہی کو افطاری تقسیم ہوتی تھی۔
اُس کو بھی حصّہ ملتا تھا بچّہ سمجھ کر ہر چیز میں سے کچھ کچھ زیادہ دیدیتے تھے۔
مگر اُس کو منھ پر رکھنا قسم تھا۔ لوگ کھاتے اور یہ مُنھ دیکھتی۔ بہتیر اسمجھاتے
کہ بھائی یہ کیا بُری عادت ہے۔ چیز ہوتے سہاتے تم نہیں کھاتیں

[1] جانماز [2] لوٹا مٹی کا۔

مگر یہ اللہ کی بندی چکھتی تک بھی تو نہیں تھی۔ پہلے مجھ کو خیال ہوا کہ شاید خست کی وجہ سے نہیں کھائی مگر میں نے پوچھا تو کہنے لگی آپا بغیر کوئی چیز میرے حلق سے نہیں اُترتی۔ دیکھو دن بھر تمھارے لڑکے کو لئے رہتی ہے اور لڑکے کو بھی کچھ ایسا آرام ملتا ہے کہ کیسا ہی پھڑکتا ہو، اس کی گود میں گیا اور چپ، اور تمھاری کیا خصوصیت ہے ہر ایک سے وہ اسی طرح محبت سے ملتی ہے۔ میں تو تم سے سچ کہوں، مجھ کو تو بہت ہی پیار آتا ہے۔ جب آتی ہوں خوب بھینچ بھینچ کر کئی کئی دفعہ گلے لگاتی ہوں۔

نعیمہ۔ جس کو دیکھتی ہوں حمیدہ ہی کا کلمہ پڑھتا ہے اور میری یہ کیفیت ہے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے۔

صالحہ۔ اچھی کیوں؟

نعیمہ۔ مجھ کو اماں سے اسی نے بُرا بنوایا۔ ورنہ آج تک مجھ کو اماں نے کبھی ہوں، بھی نہیں کہا تھا یا آج چھوٹتے کے ساتھ نہ بات نہ چیت مجھ کو تھپیڑ کھینچ مارا۔ خیر الٰہی، حمیدہ بندی تجھ کو انھیں ہاتھوں سے اماں جوتیاں ماریں تب میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے اور جیسی تو آجکل سر چڑھی ہے ویسی ہی نظروں سے گرے تب میرے دل کی مراد بر آئے۔

صالحہ۔ خالہ اماں نے تم کو تھپیڑ مارا۔ یہ کب اور کیوں؟

نعیمہ۔ آج صبح ذرا کی ذرا لڑکا حمیدہ کو دیکر میں ہاتھ منھ دھونے چلی گئی۔ تم کہتی ہو کہ بھانجے پر فدا ہے۔ لڑکے کو روتا ہوا زمین میں

پٹک دیا اُس کو اتنا بھی ترس نہ آیا کہ ابھی پسلی کے دُکھ سے مرمر کر بچا ہے یوں جو زمین میں بٹھائے دیتی ہوں ایسا نہ ہو کہیں اس کو صبح کی ٹھنڈی ہَوا لگ جائے اور پھر بیمار پڑے۔ بس اتنا قصور میرا ضرور ہے کہ میں نے ہَولے سے حمیدہ کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ کا لگانا تھا کہ وہ فیلھالی دھڑام سے تخت پر گر پڑی۔ کہیں ذرا سی خراش آگئی۔

صالحہ ۔ کیا کہوں مجھ کو تو یقین نہیں آتا کہ حمیدہ اور بھانجے کو بے سبب روتا ہوا زمین میں بٹھا دے اور خالہ جان حمیدہ کی طرف ہو کر تم کو ماریں۔ بھلا جاؤں خالہ جان سے پوچھوں؟

نعیمہ ۔ حمیدہ کے بٹھا دینے کا سبب میں بتاؤں۔ اُن کی نماز قضا ہوتی تھی اور اُن کی اماں جان اس بات پر بگڑیں کہ میں نے نماز کو کیوں بُرا کہا۔

صالحہ ۔ پھر تم نے نماز کو بُرا کہا تھا؟

نعیمہ ۔ کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں۔ اماں کو تو کچھ نہیں کہا۔ نماز کو بُرا کہنا اُن کو کیوں بُرا لگا۔

صالحہ ۔ بھلا کوئی آدمی تمھارے ماں باپ کو بُرا کہے تو تم کو بُرا لگے یا نہ لگے؟

نعیمہ ۔ اماں جان کو کوئی شوق سے بُرا کہے مجھ کو ذرا بُرا تو لگنے ہی کا نہیں۔

صالحہ ۔ آج یا سدا سے؟

نعیمہ ۔ مسکرانے لگی اور بولی کمبخت بیجا ہنسی کو دیکھو کہ خود بخود چلی آتی ہے۔ نہ بُوا ایسی باتیں ہم سے نہ کرو۔

صالحہ - کیا خوب! میں تمھارے ایسے غصّے سے نہیں ڈرتی - بہت کروگی - خالہ جان نے تم کو ایک طمانچہ مارا ہے تم مجھ کو دو طمانچے مار لینا - لیکن اماں باوا کا اتنا پاس نہیں تھا تو سُسرال والوں سے لڑیں کیوں؟

نعیمہ - بات بات میں ناحق کوئی بُرا کہا کرے تو جی نہ جلے -

صالحہ - میں یہ کب کہتی ہوں کہ نہ جلے - لیکن خالہ جان نے نماز کا پاس کیا اور اُن کو تمھاری بات بری لگی تو بیجا کیا ہوا؟

نعیمہ - تو کیا نماز اُن کی اماں ہے یا نانی ہے؟

صالحہ - جن کو ایمان ہے اُن کو ماں سے بڑھ کر پیاری اور نانی سے زیادہ عزیز ہے -

نعیمہ - تو کیا میں تمھارے نزدیک بے ایمان ہوں؟

صالحہ - آدمی ہی بے ایمان بھی ہوتے ہیں - جو بے ایمانوں کا کام کرے وہ بے ایمان - میں ہوئی تو میں اور تم ہوئیں تو تم -

نعیمہ - دیکھو صالحہ! خدا کی قسم ایسی باتوں پر لڑائی ہو جائے گی بے ایمان تم ہوگی تمھارے رہتے سہتے بے ایمان ہوں گے -

صالحہ - خدا کے فضل سے میں تو بے ایمان نہیں ہوں مگر رہتے سہتے کون ہوئے؟ تُم -

نعیمہ - بھلا ایمان سے کہنا تم نے میری کون سی بات بے ایمانوں کی سی دیکھی؟

صالحہ - ایمان سے مت کہلاؤ۔

نعیمہ - نہیں تمھیں خدا کی قسم - بھلا کوئی بات تو بتا دو؟

صالحہ - پھر بُرا تو نہیں مانیں گی۔

نعیمہ - سچی بات میں بُرا ماننے کی کیا وجہ؟

صالحہ - سچ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تمھارے قول و فعل کوئی بھی ایمان داروں کے سے نہیں - اور مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے - تم خود ہی بتا دو کہ میں فلانا کام ایمان والوں کا سا کرتی ہوں - کھانا، پینا، سونا، گھر کا کام دھندا، بچّوں کا پالنا - یہ تو دنیا میں بُرے بھلے سب ہی کیا کرتے ہیں بھلا ایک کام تو ایسا بتاؤ جس سے تمھارا ایماندار ہونا پہچانا جائے۔

نعیمہ - بھلا دُنیا میں تمھارے نزدیک کوئی بھی ایماندار ہے یا نہیں؟

صالحہ - کیوں نہیں! اللہ کے بندے سیکڑوں ہزاروں۔

نعیمہ - بھلا میں بھی کسی کا نام سُنوں؟

صالحہ - دُور کیوں جاؤ - یہ تمھاری گلی ہی میں ایک حضرت بی رہتی ہیں - جن کے نواسے بھائی سلیم کے ساتھ مدرسے میں پڑھنے جاتے ہیں بس ایماندار اُن کو کہتے ہیں - دیکھو تو کیا نیک زندگی ہے۔

نعیمہ - میں تو اُن کو دن بھر سیتے ہی دیکھتی ہوں۔

صالحہ - سچ ہے مگر خدا کے واسطے غریب غربا کے کپڑے مُفت اور امیروں کے مزدوری پر - لیکن جتنی سلائی ہوتی ہے سب اللہ کے نام

دیتی ہیں - ایک پیسا اپنے اوپر خرچ نہیں کرتیں - یہ عمر اور کڑاکے کے جاڑوں میں پہر رات رہے سے اُٹھ کر خدا کی عبادت، گھر میں نوکر نہیں، چاکر نہیں - اپنے ہاتھوں سارے گھر کا کام کاج اور اس پر نماز کی یہ پابندی کہ تہجد تک قضا نہیں ہونے پاتا - محلے میں کتنی لڑکیوں کو انھوں نے پڑھنا سکھایا - کتنیوں کو حیوان سے آدمی بنایا - اور حسبۃً للہ بے غرض - بے مطلب - میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مسجد کے کوئی پندرہ [۱۵] بیس [۲۰] مسافر دونوں وقت روٹی پکوانے کو آٹا بھیجدیتے ہیں اپنے ہاتھوں سب کا آٹا گوندھنا - پکانا - گھر سے دال سالن جو کچھ وقت پر موجود ہوا دینا اکثر ایسا ہوا ہے کہ سالن نہیں بچا - آپ روکھی روٹی کھاکر اُٹھ کھڑی ہوئیں - بیچارے مسافر اکثر جوار باجرے کا آٹا لے آتے ہیں وہ تو آپ رکھ لیتی ہیں اور اپنے گھر سے اُن کو گیہوں کی روٹی بھیج دیتی ہیں - ایک دن باجرے کی روٹی وہ بھی روکھی بیٹھی کھا رہی تھیں - نوالہ حلق سے نہیں اُترتا تھا - ہر ہر لقمے کے بعد پانی پینے کی ضرورت ہوتی تھی - میں جو جا نکلی تو مجھ کو دیکھ کر کہنے لگیں " بیٹا! مجھ کو باجرے کی روٹی بہت ہی بھاتی ہے - کچھ ایسی سوندھی میٹھی اور خستہ ہوتی ہے کہ سبحان اللہ " ایک طالب علم نے اُن سے گاڑھے کی مرزائی[۱] سلوائی اور شاید وہ پہلا ہی کپڑا تھا کہ اُس بیچارے کو سلوانے کا اتفاق ہوا - اس واسطے کہ جب وہ شخص کپڑا لیکر دروازے پر آیا تو حضرت بی صاحب نے

---

[۱] ایک قسم کی واسکٹ - صدری -

اُس سے کہا کہ " بیٹا! اپنی پُرانی مرزائی بھی بھیجدو کہ اس کو دیکھ کر قطع کروں " تو اُس نے نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ " مائی صاحب میرے پاس کوئی مرزائی نہیں ہے "۔

حضرت بی صاحب ۔ " بیٹا! مرزائی نہ ہو تو انگرکھا ہی سہی۔ خیر کچھ اٹکل تو مل جائے گی ۔

طالب علم ۔ انگرکھا بھی نہیں ۔

مجبوراً اندر پردے میں حضرت بی صاحب نے اُس سے پوچھ لیا کہ کمر کتنی ہے ۔ چولی کتنی نیچی رہے گی ۔ آستین کس قدر لمبی ہوگی ، اس طالب علم نے بتایا ۔ لیکن دیکھا تو کپڑا کمی کرتا تھا ۔ تب اُس طالب علم نے کہا کہ مائی صاحب جس طرح ہوسکے کھینچ تان کر اس میں بنا دو ۔ اور آج نماز جمعہ سے پہلے سی دو ۔ کہ الوداع کا دن ہے میں جامع مسجد پہن کر جاؤں ۔ غرض مرزائی سی گئی تو اُس کے بدن میں ٹھیک نہ آئی ۔ وہ بیچارہ مایوس ہو کر رو دیا اور اُس ناامّیدی میں حضرت بی صاحب پر تنا خفا ہوا کہ شاید کوئی گھر کی لونڈی پر بھی نہیں ہوتا ۔ اندھی ۔ بیوقوف ۔ بے تمیز ۔ پھوہڑ ۔ بدسلیقہ ۔ بیرحم ۔

جو کچھ اس کے منہ میں آیا بیدریغ کہہ ڈالا ۔ باوجودیکہ گھر میں سب کو بُرا معلوم ہوا لیکن حضرت بی صاحب ردتی جاتی تھیں اور اُلٹی اس کی استمالت[۱] کرتی تھیں ۔ بڑے نواسے کا نیا تہ دوز ۔ چکن کا کرتہ اس کو دیا

---

[۱] دلجوئی ۔

لیکن اُس نے دُور اُٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ "مجھ کو بدن ڈھکنے کے واسطے کپڑے کی ضرورت ہے ۔ یہ واہیات کپڑا میرے کس کام کا ہے جس کو پہن کر آدمی ننگے کا ننگا ۔ حضرت بی صاحب نے اپنے نواسوں کی تمام گٹھریاں کھول ڈالیں ۔ خاصہ ۔ تن زیب ۔ ململ ۔ ڈھاکہ ۔ پاٹن ڈوریہ ۔ ریگ ۔ شبنم ۔ نینو ۔ سوزن کار ۔ طرح طرح کے قیمتی خوش وضع اور طرحدار کپڑے اُس کو دکھائے اور ایک اُس کو پسند نہ ہوا ۔ کسی کو تو اس نے کہا "مردوں کے استعمال کے قابل نہیں کیسی کی نسبت تجویز کیا کہ یہ متکبّروں کی پوشاک ہے آخر حضرت بی نے بازار سے کورا لٹھا منگوا ۔ نماز جمعہ سے پہلے اس کی مرزائی تیار کی ۔ تب وہ طالب علم ٹلا ۔ حضرت بی کی طرح کوئی اپنا پتّا مارے ۔ تب ایمان کا دعویٰ کرے ۔ اب تم خود غور کر لو کہ دن رات میں تم ایمانداروں کے سے کتنے کام کرتی ہو؟

نعیمہ ۔ ایک حضرت بی ایسی ہوئیں ۔ بھلا کوئی دوسری عورت بھی اس مزاج کی شہر میں ہے؟

صالحہ ۔ چونکہ تم اس طرح کے لوگوں سے نفرت رکھتی ہو اس واسطے تم کو معلوم نہیں ورنہ شہر میں بہتیرے خدا کے نیک بندے پڑے ہیں ۔ کہاں تک اُن کے نام گنواؤں ۔ ہے کیا کوئی کم کوئی زیادہ ۔ ایک میری ہی اماں ہیں وہ بھی اپنے محلّے کی حضرت بی ہیں ۔

نعیمہ ۔ دو چار آدمی اس طرح کے ہوئے سہی ۔ میں تو اپنی ہی جیسی عورتیں اکثر دیکھتی ہوں ۔

صالحہ ۔ بیشک دُنیا میں نیک کم ہیں اور بُرے بہت ۔
نعیمہ ۔ میں جانتی ہوں عورتوں کے واسطے بہت نماز روزے کی کچھ ضرورت نہیں ۔ بس اُن کی یہی عبادت ہے کہ گھر کے کام کاج دیکھیں ۔ بچوں کی خبر گیری کریں ۔ اُن کو خانہ داری کے بکھیڑوں سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ نمازیں پڑھا کریں ۔ مرد البتہ نہ کھانے پکانے کا فکر نہ بچوں کا جھگڑا ۔ جتنی چاہیں عبادت کریں ۔
صالحہ ۔ مردوں کو کمانے کا تھوڑا کام ہے کہ بیچارے دن دن بھر اُسی میں لگے رہتے ہیں ۔ محلہ کے دبگیوں کو دیکھو کہ منھ اندھیرے سے جو کھٹا کھٹ شروع کرتے ہیں تو آدھی آدھی رات تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی ۔ پھر بھی جتنا خدا کا خیال مرد رکھتے ہیں عورتیں کمبخت اُس کا آدھا پاؤ بھی نہیں رکھتیں ۔
نعیمہ ۔ تم چاہے کچھ ہی کہو ۔ عورت مرد کی برابری تو ہرگز نہ ہوگی ضرور اللہ میاں نے عورتوں کے حق میں کچھ نہ کچھ آسانی رکھی ہوگی ؟
صالحہ ۔ سبب ؟
نعیمہ ۔ بھلا کہیں نگوڑی عورتوں سے محنت ہو سکتی ہے ؟
صالحہ ۔ عبادت میں نہ چھپر اُٹھانا ہے ، نہ لکڑیاں ڈھونڈنی ہیں عورتیں کمزوری کا عذر اور نزاکت کا حیلہ پیش کریں بلکہ ایک حساب سے عورتوں کو زیادہ عبادت کرنی چاہیئے کیونکہ اول تو عورتوں کو عبادت کی فرصت زیادہ ملتی ہے دوسرے غذا کی نعمتوں میں سے عورتیں زیادہ حصہ

پاتی ہیں۔ کھانے پینے میں مرد عورت سب برابر، کپڑے میں مرد بیچارے ایک حصہ، تو عورتیں ویسے دیسے دس۔ نہ عورتوں کا ایک پائجامہ مردوں کا ایک برس کا سارا لباس اور یوں بھی عورتوں کی پوشاک عموماً عمدہ اور بیش قیمت ہوتی ہے۔ بہ نسبت مردوں کے۔ بڑی رقم ہے زیور، عورتوں کو سونے کی کان میں قبر کھود کر گاڑ دو تب بھی بس نہیں۔ مرد بیچارے جو ثقہ[1] اور ضعدار ہیں۔ چاندی کا چھلا تک بھی نہیں پہنتے اس پر بھی عورتیں عبادت میں کمی کریں تو اُن کی وہی کہاوت ہے، کھانے کو ججّہ[2] اور کام کو ننّا بچّہ۔

نعیمہ۔ تم تو اچھی میری قسمت کی، سچ مچ مولوی صاحب بن گرآئیں۔

صالحہ۔ مولویوں کے درجے مولویوں کے ساتھ ہیں میں بیچاری کس لائق ہوں۔ مولویوں کی جوتیوں کی برابری بھی نہیں کر سکتی۔

نعیمہ۔ افسوس ہے کہ تم ہماری امّاں کے یہاں پیدا نہ ہوئیں!

صالحہ۔ افسوس کی کیا بات ہے بلکہ میں تو سمجھتی ہوں شکر کا مقام ہے۔

نعیمہ۔ کیوں؟

صالحہ۔ تم بتاؤ کہ تم نے کیا سمجھ کر افسوس کیا؟

نعیمہ۔ میں نے تو یہ سمجھ کر افسوس کیا کہ تم ہماری امّاں جان کے یہاں ہوتیں تو دونوں کو اچھا تھا۔ ہماری امّاں تم جیسی بیٹی ڈھونڈتی ہیں۔ اور تم بھی امیر گھر پاتیں تو کھانا کپڑا نہ یہ نہ وہ کہ سب ہی

---

[1] زاہد و عابد [2] زچہ

طرح کی خوشی تھی۔

صالحہ - اگر اس خوشی کا یہی نتیجہ ہے کہ آدمی خدا کو بھول جائے تو میرے نزدیک یہ تمام فراغت دُنیا کا جنجال اور آخرت کا وبال ہے کون چار دن کی خوشی کے واسطے ہمیشہ ہمیشہ کی مصیبت مول لے، مجھ کو خدا کے فضل سے پیٹ بھر روٹی اور تن بدن ڈھانک لینے کو کپڑا۔ رہنے کو مکان لیٹنے کو چارپائی پینے کو پانی۔ دم لینے کو ہوا۔ سب کچھ میسر ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مجھ کو دنیا میں کوئی اور چیز بھی درکار ہے۔ سوائے اس کے کہ تم نے پتھر یعنی سونا چاندی مجھ سے زیادہ اپنے اوپر لادلئے ہیں اور بوجھ کے صدمے سے کان تمھارے کٹے پڑتے ہیں۔ ناک تمھاری چھی گئی ہے اور تو کوئی فرق میں تم میں اور اپنے میں نہیں پاتی۔ میں یہ نہیں کہتی، خدانخواستہ تم کو کھانے کی تکلیف ہے مگر صورت تمھاری یہ ہے کہ بدن پر بوٹی نہیں۔ ہاتھ پانؤں میں جان نہیں، ہر سال جُلاب، ہر مہینہ فصد، آئے دن دوا۔ مجھ کو دیکھو کہ خدا کے فضل سے تم سے دونی نہیں تو ڈیوڑھی میں شک بھی نہیں۔ ایک ہاتھ سے تمھارے دونوں ہاتھ پکڑلوں تو بی بی صاحب سے ہلا بھی نہ جائے۔

نعیمہ - بیماری بھی امیری کا تمغہ ہے۔ نگوڑے بھوکے جن کے پیٹ کو روٹی میسر نہیں وہ کیا بیمار پڑیں گے؟

صالحہ - یہاں تمغہ اور خلعت کا مذکور نہیں ہے تکلیف اور آرام میں گفتگو ہے۔

نعیمہ - جی تو خوش کر لو - لومڑی کو جب انگور نہیں ملتے تو وہ اُن کو کھٹا کہا کرتی ہے -

صالحہ - اپنی اپنی سمجھ ہی تو ہے - تم میرے تئیں جانتی ہو کہ تکلیف میں ہے - اور میں کہتی ہوں کہ تم ایسے عذاب میں مبتلا ہو کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے - کھانے پینے کے عیش و آرام جو تم کو میسر ہیں اُن کا نتیجہ تو یہ ہے کہ تم سدا کی دُکھیا اور ہمیشہ کی روگی بن رہی ہو رہا کپڑا، کچھ تم ہی اس کو پہن کر اپنے جی میں خوش ہوتی ہو گی - ابھی خالو جان یا بڑے بھائی آ جائیں تو سوائے اس کے کہ تم اُن کے سامنے سے ہٹ بیٹھو اور کیا تدبیر ہے - رہا زیور جس کی زکوٰۃ نہ خیرات اس سے بیڑیاں بہتر، طوق اور ہتکڑی اچھی - بڑی خوشی محبت اور میل ملاپ کی ہوتی ہے - اُس کا یہ حال ہے کہ تم ماں سے بُری - حمیدہ کی دشمن - ساس سُسروں سے بگاڑ - میاں سے ناموافقت، نوکر شاکی، لونڈیاں نالاں - اسی پر تم اپنے تئیں سمجھتی ہو کہ میں خوش ہوں - ابھی تم پڑی رو رہی تھیں یا ہنس رہی تھیں؟

نعیمہ - سُبحان اللہ، آپ بھی کیا آدمی ہیں - کیا گھروں میں کبھی لڑائی نہیں ہوا کرتی - چار برتن پاس رکھ دیتے ہیں تو وہ بھی کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا اُٹھتے ہیں -

صالحہ - اگر ایسا ہی سمجھتیں تو اتنا بات کا تبنگڑ نہ بناتیں -

نعیمہ - میں نے کیا بات کا تبنگڑ بنایا؟

صالحہ۔ تمھیں اپنے دل میں سوچو۔ ماں کے ہاتھ لگانے پر یہ آفت، صبح سے اب تک آپ بھوکی مریں۔ سارے گھر کو بھوکا مارا۔ شاباش بُوا شاباش! لڑو ماں سے روٹھو خدا سے۔

نعیمہ۔ ہر پھر کر تم کو خدا کا تذکرہ کرنا ضرور، بھلا میں خدا سے کب روٹھی؟

صالحہ۔ رزق خدا کا، یا ماں باپ کا؟

نعیمہ۔ اللہ ری علّامہ[1]! دیکھو تو کیسی اینچ پینچ کی باتیں کرنی آتی ہیں۔

صالحہ۔ تم کو پیچ و تاب کی باتیں آتی ہیں تو مجھ کو اینچ پینچ کی

نعیمہ۔ غصّہ ہی تو ہے۔

صالحہ۔ اچھّا غصّہ ہے۔ باوُلا غیظ، دیوانہ غضب[2]، اُدھر بیجان پر اور اِدھر بے زبان پر۔

نعیمہ۔ بے جان اور بے زبان کیا؟

صالحہ۔ کھانا بے جان بے زبان تمھارا بچّہ نادان۔ میں نے سُنا ہے کہ تم نے اُس کا بھی خوب کچلا کیا؟

نعیمہ۔ کیا تو کسی کو کیا۔ اپنا بچّہ شوق سے مارا خوشی سے کچلا کیا۔

صالحہ۔ تم اپنے بچّے کو شوق سے مارو اور خوشی سے کچلا کرو۔

---

[1] سخت مکّارہ [2] بہت تیز غصّہ۔

پھر خالہ جان نے تم کو ایک تھپڑ ہوئے سے مار دیا تو کیا غضب ہوا؟ جیسی تم اپنے بچے کی ماں، وہ تمھاری ماں۔

نعیمہ - ماں ماں برابر۔ لیکن بچہ بچہ برابر نہیں۔

صالحہ - لیکن تم دونوں میں زیادہ تر واجب الرعایۃ کون ہے؟

نعیمہ - میں۔

صالحہ - میں کے گلے پر چھری۔ کیا واجب الرعایۃ نکلی ہیں۔ ذرا منھ تو دھو رکھو۔

نعیمہ - دیکھو بڑوں کے ساتھ بے ادبی!

صالحہ - بڑوں نے کی تو چھوٹوں نے سیکھی۔

نعیمہ - اجی وہ کچھ بھی رعایت میرے ساتھ نہ کریں۔ اللہ مالک ہے۔

صالحہ - کیوں جھوٹ بولتی ہو؟

نعیمہ - بس سب کچھ کہنا جھوٹی نہ کہنا۔ اس کی مجھ کو بڑی چڑھ ہے۔ جو کوئی مجھ کو جھوٹی کہتا ہے تو میرے تن بدن میں آگ ہی تو پھنک جاتی ہے۔

صالحہ - بھلا پھر تم اللہ کو مالک سمجھتی ہو جو کہتی ہو؟

نعیمہ - کوئی ایسا بھی بندہ بشر ہے جو اللہ کو مالک نہیں سمجھتا؟

صالحہ - اللہ کو مالک سمجھتیں تو ایسی بیجا بات بول اُٹھتیں

---

[1] رعایت کے قابل۔

جس پر خالہ جان خفا ہوئیں اور بجا خفا ہوئیں۔

نعیمہ - کیا میں نے جان بوجھ کر تھوڑی ہی کہی تھی منھ سے نکل گئی۔

صالحہ - لیکن کبھی خالو جان کی شان میں تو ایسی بات تمھارے مُنھ سے نہیں نکلتی۔ بلکہ خالو جان تو خیر، شاید بڑے بھائی جان کو بھی ایسا سخت کلمہ کہو تو اُن کو کتنا بُرا لگے۔ کیا خدا کو بُرا نہ لگا ہوگا۔

یہ سُن کر نعیمہ کسی قدر ڈری اور اس نے ہَولے ہَولے اپنے کلّوں پر طمانچے مارے اور مُنھ سے بھی توبہ توبہ کہا۔

صالحہ - بس سمجھ لو کہ ایسا ہی ایک طمانچہ خالہ جان نے مارا تھی۔

نعیمہ - تو میں کیا کچھ کہتی ہوں یا میں نے کچھ کہا؟

صالحہ - اے کاش! تم سب کچھ کہہ لیتیں اور یہ ستم نہ کرتیں۔

نعیمہ - کیا؟

صالحہ - سارے دن گھر بھر کو بھوکا مارا - بچّہ تمام دن دودھ کو پھڑکا۔ بیدارا بیچاری دہ سہ درے میں پڑی ہائے ہائے کر رہی ہے۔ نہیں معلوم کہاں اُس کے بے موقع لات لگی ہے کہ اب تک اُس کا سانس پیٹ میں نہیں سمایا اور پھر کہتی ہو کیا کیا؟

نعیمہ - خیر پھر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

صالحہ - ہو تو نہیں چکا ہو رہا ہے۔ لوگ بھوکے بیٹھے ہیں۔ بچّہ پھڑکے چلا جاتا ہے۔

نعیمہ - اچھی! کچھ یہ بھی زبردستی ہے "ماروں اور رونے نہ دوں"۔
صالحہ - تم کو اتنی بڑی ہو کر رونے کا نام لیتے ہوئے شرم نہیں آتی؟
نعیمہ - جب مار کھانے کی غیرت نہ ہوئی تو رونے میں کیا شرم تھی۔
صالحہ - ماں ہوئی، اُستانی ہوئی - اگر اُن کی مار کھانا بے عزّتی ہے تو دُنیا بے عزّت ہے۔
نعیمہ - تم کو مار پٹی ہوتی تو جانتیں کہ عزّت کی بات ہے یا بے عزّتی کی۔
صالحہ - اُستانی کی مار کی تو گنتی نہیں۔ امّاں جان نے بھی مجھ کو کوئی بیسوں ہی دفعہ مارا ہوگا۔
نعیمہ - اب بڑے ہونے پر؟
صالحہ - اب میں کوئی بات ہی ایسی نہیں کرتی کہ اُن کے خلاف مزاج ہو۔
نعیمہ - میں نے بھی تو یہ سمجھ کر نہیں کہا تھا کہ امّاں جان کو اتنا بُرا لگے گا۔ نہ کبھی پہلے امّاں جان کو نماز روزے کا ایسا خیال ہوا جیسا کہ اب ہے۔
صالحہ - لیکن جب تم کو خالہ جان کئی مرتبہ روک چکی تھیں تو تم کو اُن کی ممانعت کے خلاف پھر وہی بات نہیں کہنی چاہیئے تھی۔
نعیمہ - کیوں جی! خدا کو میری بات بُری لگتی تو جو کچھ ہونا تھا اُسی وقت ہو نہ چکتا؟

صالحہ ۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ بات بیجا اور بری تھی یا نہیں ؟

نعیمہ ۔ خیر بری ہی سہی ۔

صالحہ ۔ سہی کیا معنی ؟ شدت سے بری اور بیجا تھی کہ تم اپنے بھائی تک کو ایسا کلمہ نہیں کہہ سکتیں ۔ ایسی ہی باتوں کا نام کفر اور شرک ہے ۔ مگر اس سے کہ تم کو فوراً سزا نہیں ملی خوش نہیں ہونا چاہیئے ۔ خدا کی لاٹھی[1] میں آواز نہیں ۔ عجب کیا ہے کہ ایسی ہی باتوں کا وبال تم کو گھر میں نہیں بسنے دیتا ۔

نعیمہ ۔ اماں مجھ کو تنہائی میں مار لیتیں تو مجھ کو اتنا رنج نہ ہوتا ۔

صالحہ ۔ سبحان اللہ خطا بباز ار و سزا در پسِ دیوار[2]

نعیمہ ۔ اچھا ! پھر اب تمہاری مرضی کیا ہے ؟

صالحہ ۔ مرضی یہ ہے کہ چل کر خالہ جان کے روبرو ہاتھ جوڑ دو ، اُن کے پاؤں پڑو ۔ اپنا قصور معاف کراؤ ۔ کھانا آپ کھاؤ ۔ دوسروں کو کھانے دو ۔ بچّے کو دودھ پلاؤ ۔ حمیدہ کو بلا کر گلے لگاؤ ۔ بیدارا کی دلدہی اور تشفی کرو ۔

نعیمہ ۔ لو ، اور سنو ! اُلٹا چور کوتوال کو ڈانڈے ۔ میں ہی پٹوں اور میں ہی ہاتھ بھی جوڑوں اور اگر میرا قصور ہوتا بھی تاہم ہاتھ تو بندی نے نہ آج تک کسی کے آگے جوڑے اور نہ اب مجھ سے جوڑے جائیں ۔ رہی حمیدہ ، تم کہتی ہو گلے لگاؤ اور میرا بس چلے تو اُس کو جیتا نہ چھوڑوں

[1] خدا بدلہ لیتا ہے مگر آہستگی سے [2] قصور تو بازار میں کرو سزا گھر میں دی جائے ۔

اور کھانے کی جو تم نے کہی تو مجھ کو اب اس گھر کا نمک تک چکھنا حرام ہے۔ غرض جتنی باتیں تم نے کہیں، سوچ کر ایسی ہی کہیں کہ ایک بھی مجھ سے شدنی نہیں۔ خیر، تمھاری خاطر سے ننّے کو دودھ پلا دوں گی جاؤ کہیں لے آؤ ورنہ ارادہ تو یہی تھا کہ اُس کا اور اپنا دونوں کا خون کر دوں۔

صالحہ ۔ اللہُ اکبر۔ بی آپا! میں نہیں جانتی تھی کہ تمھارا غصّہ اس قدر غضب کا بُجھا ہوا ہے۔

نعیمہ ۔ میرا مزاج تو سدا سے اسی طرح کا ہے۔ مجھ سے کسی کی بات کی برداشت نہیں ہوتی۔

صالحہ ۔ اب تم سے زیادہ کہنا لاحاصل ہے۔ بس معلوم ہو گیا کہ تم اپنی خوشی کی ہو۔

نعیمہ ۔ جو بات کرنے کی تھی وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دی کہ ننّے کو دودھ پلا دوں گی۔

صالحہ ۔ تمام دن تو تم کو بے آب و دانہ گزر گیا اور عمر بھر کے بدلے کا تم نے ایسا لمبا روزہ رکھا ہے کہ پہر رات گزری مگر افطار ہونے نہیں آیا اور نہ ابھی کچھ اُس کے افطار ہونے کی اُمید ہے تو وہ دودھ رہا کہاں ہوگا کہ تم ننّے کو پلاؤ گی۔

نعیمہ ۔ رہے یا نہ رہے مگر میں اس گھر کا کھانا کھاؤں تو حرام کھاؤں، مُردار کھاؤں۔

صالحہ ۔ پھر آخر کرو گی کیا؟ یہ تو ممکن نہیں کہ بے کھائے گزر ہو

ایک ہی وقت میں دیکھو، تمھارا کیا حال ہو گیا ہے۔ اب رات کو خالی پیٹ نیند بھی تو نہیں آنے کی۔

نعیمہ - میں تو جانے کو تیار بیٹھی ہوں۔ تم نہ آجاتیں تو اب تک کبھی کی چلی بھی گئی ہوتی۔

صالحہ - کہاں۔ سسُرال؟

نعیمہ - اگر میں سسُرال جاؤں تو گڑھے سے نکلوں اور کنویں میں گروں۔

صالحہ - پھر کہاں؟

نعیمہ - جہاں سینگ سمائیں۔

صالحہ - باؤلی ہوئی ہو کیسی باتیں کرتی ہو۔ اگر خالو جان یہ بات سن پائیں نہیں معلوم کیا آفت برپا کریں اور گھر سے باہر قدم نکالنا تو بڑی بات ہے۔

نعیمہ - تم کیا سمجھیں؟ میں اس ہمسائی کے یہاں جانے کو کہہ رہی ہوں۔ کیا یوں ہر روز میں ہمسائی کے گھر نہیں جاتی؟

صالحہ - وہ جانا اور ہے، اور گھر سے لڑ کر بے حکم پاؤں باہر نکالنا دوسری بات ہے۔ خبردار ایسا لفظ بھول کر بھی منہ سے مت نکالنا۔ نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے گا۔ اور خود ہمسائی جن کے برتے پر بھولی ہو تم کو اپنے دروازے کے اندر قدم تو رکھنے دینے ہی کی نہیں۔ چاہو جا دیکھو۔ اور فرض کیا کہ تم یہاں سے نکلنے پائیں اور ہمسائی کی بھی ایسی ہی شامت آئی ہے اور اُنھوں نے تم کو گھر میں آنے دیا تو اُن کو خود

دو دو وقت کھانا میسر نہیں آتا ۔ تم کو کہاں سے کھلائیں گی ؟

نعیمہ ۔ نوج، میں اُن کے یہاں کیوں کھانے لگی کیا میرے پاس زیور نہیں ؟ ابھی تو پٹاری میں کچھ نہ ہوگا تو نقد چالیس پچاس روپے پڑے ہوں گے ۔

صالحہ ۔ گڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز ۔ جن کا کھانا اُنھیں کا بنوایا ہوا زیور اُنھیں کے دیے ہوئے روپے ۔ آن تو ہم جب جانیں کہ اُن کی چیز بھی صرف نہ کرو اور ہمسائی اوّل تو ہیں حیران، تم کو بٹھائیں تو کہاں بٹھائیں ۔ کلھیا جتنا گھر ۔ اس میں بھی ایک آپ ایک میاں، تین بیٹے، بہویں، اُن کے بچے ۔ دو بیٹیاں مہمان آئی ہوئی ہیں، اور اُن کے گھر میں تل رکھنے کی جگہ تو ہے ہی نہیں ۔ بیچاری آپ تو ڈیوڑھی میں چارپائی بچھا کر سوتی ہیں ۔ تم کو رات کے وقت کہاں لٹائیں اور کہاں سلائیں اور تم کو غیر مردوں میں جاتے ہوئے شرم نہ آتی اور پھر ہمسائی تم کو پناہ دیتیں بھی تو خالہ جان ہی کا پاس کر کے غرض قربان جائیے تمھاری عقل کے ۔ تدبیر بھی سوچی تو اوندھی ۔ علاج بھی تجویز کیا تو الٹا ۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم اپنی سسرال چلی جاتیں ۔

نعیمہ ۔ نہ سسرال جاؤں نہ یہاں کھاؤں ۔

صالحہ ۔ تم کو اختیار ہے جو چاہو سو کرو لیکن کیا لڑائی تمھارے کھانے پر ہوئی ہے ۔

نعیمہ ۔ کھانے پر تو لڑائی نہیں ہوئی لیکن میں ان کے گھر پر

یوں نہ پڑی ہوتی تو مجال تھی کہ کوئی مجھ کو ہاتھ لگا لیتا۔

صالحہ ۔ کرتیں کیا؟

نعیمہ ۔ برابر سے میں بھی مارتی۔

صالحہ ۔ بُرا مت ماننا۔ یہی نیت ہے تو تم گھر میں بس بھی چکیں
ماں کا یہ دُقر۔ یہ ادب، مجھ کو تو اگر میری اماں جان، بے خطا، بے قصور
جوتیاں ہی جوتیاں مار لیں تو انشاء اللہ آنکھ بھی اُن کے سامنے نہ کروں
اور دُنیا جہان کی بیٹیوں کا یہی قاعدہ، یہی دستور ہے۔ تم اُن کی بیٹی،
وہ تمھاری ماں، کسی کو تمھارے معاملے میں کیا دخل مگر آپا جان دین تو
گیا ہی گزرا ہوا۔ یہ چھن دُنیا میں بھی خوش اور آباد رہنے کے نہیں۔
اور خدا تم کو اتنی سمجھ دے کہ تم انھیں باتوں کو اپنی خانہ ویرانی کا سبب سمجھو۔
مجھ کو حیرت ہے کہ کیونکہ یہ بات تمھارے دل نے تسلیم کی کہ خالہ جان کو
تمھارا رہنا ناگوار ہے اور اُنھوں نے اس وجہ سے تمھارے ساتھ سختی کی کہ
وہ تم کو اپنے پاس دیکھ نہیں سکتیں؟ بھلا دنیا میں کوئی ماں بھی اس طرح
کی ہوگی؟ تمھاری خانہ ویرانی کا رنج تم سے زیادہ اُن کو۔ ذرا اس کا مذکور
آجاتا ہے تو اُن کے آنسو نکل پڑتے ہیں اور حاضر غائب دعا کیا کرتی ہیں
کہ "الٰہی میری نعیمہ کو اُس کے گھر آباد کر۔" بھلا تم ہی انصاف کرو کہ
سوائے اس بات کے تم نے اُن کی کسی اور بات سے بھی اُن کا رُخ
بدلا ہوا پایا۔ کھانے میں اُن کو یہ اہتمام رہتا ہے کہ پہلے تم اور پیچھے اور۔

لہ عزت۔

ییں نے ہفتوں رہ کر دیکھا ہے ۔ خالو جان اور بڑے بھائی تک کو سادی چپاتیاں ملتی ہیں اور تمھارے دوپراٹھے اُنھوں نے ناغہ نہیں ہونے دیے ۔ چار پیسے روز کا سودا جو تمھارا سدا کا معمول ہے تم ہی بتاؤ کبھی نہیں بھی دیا؟ ایک دن حمیدہ نے ضد کی تھی اور کہا تھا کہ "میں بھی چار پیسے لوں گی" تو جھڑک دیا کہ "ہاں اب تو بڑی بہن کی برابری کرے گی" آٹھویں دن منہدی، چھینے کے چھینے چوڑیاں ۔ تم ہی بولو، یہ دستور کبھی قضا ہوا ہے ؟ کپڑے لوگ ایسے جہیز میں بھی نہیں دیتے جو وہ تم کو گھر میں پہناتی ہیں ۔ بھلا بے گوٹے کا ڈوپٹہ ۔ بے پیمک کا پائجامہ کبھی تم کو پہنا یا ہے ؟ تیل ۔ عطر ۔ پان ۔ پھول ۔ منہدی ۔ سُرمہ ۔ مسّی ۔ لاکھا ۔ مجنٹن اور بٹنا ۔ یہی عورتوں کی ضرورت کی چیزیں ہیں ۔ سچ کہنا تم کو کبھی ان میں سے کسی چیز کی مانگنے کی ضرورت ہوئی ہے ؟ خدمت کو لونڈی جدا لڑکے کی کھلائی الگ، بلکہ سچ پوچھو تو کنوارپنے سے کہیں زیادہ تمھاری قدر ہوتی ہے ۔ خالہ جان ایک دن تمھارے دوپٹے میں بیٹھی توئی ٹانک رہی تھیں ۔ خالو جان کی قبا میں بند ٹانکنے تھے کچہری جانے کو دیر ہوتی تھی اُس پر خالو جان نے کہا بھی کہ لڑکی کا دوپٹہ رہنے دو ۔ پھر ہو رہے گا پہلے میری قبا میں بند ٹانک دو ۔

خالہ جان ۔ واہ لڑکی سر کھولے بیٹھی ہے ۔ تم کو ایسی کیا جلدی ہے ۔ ابھی تو دھوپ بھی چبوترے سے نہیں اُتری ۔

خالو جان ۔ کیا سادہ دوپٹہ اوڑھنا منع ہے ؟

خالہ جان۔ وہ بیچاری کیا کچھ کہتی ہے؟

خالو جان۔ تو تم اپنی ہی طرف سے خیر خواہی کے اہتمام میں لگی رہتی ہو؟

خالہ جان۔ میں ہوں کس قابل۔ مگر خیر جو کچھ ہو سکتا ہے کئے جاتی ہوں۔ مجھ کو ہر وقت اس بات کا خیال لگا رہتا ہے کہ اس کا دل ہے غمزدہ، ایسا نہ ہو کسی چیز کو اُس کی طبیعت چاہے اور یہ لحاظ کے مارے مُنھ سے نہ کہہ سکے اور ارمان جی کا جی ہی میں رہ جائے۔

اگر خالہ جان کو خدانخواستہ تمھارے ساتھ عداوت تھی تو خود کھا نا کھالیتیں۔ دُشمن کا یہی کام ہے کہ فاقے میں ساتھ دے اور شریک مُصیبت ہو؟ وہ حمیدہ جس کو تم کہتی ہو کہ پاؤں تو مار مار کر پُرزے اُڑاؤں، آج دن بھر اُس کو تمھارے واسطے روتے گزرا ہے۔ یہ عمر اور اتنا صبر کہ صبح سے اب تک دانہ اُس کے منھ میں نہیں گیا۔ نگوڑی ایسی بے سُدھ پڑی ہے کہ گویا جان نہیں۔ ان لوگوں کا وہ حال اور تمھاری یہ کیفیت، ایک ذرا سی بات میں تمھارا دل اس قدر پھر گیا کہ ساری نیکی برباد۔ کل سلوک اکارت۔ تمام احسان غارت۔ پھر بھلا تم سے کوئی کیا توقع رکھے اور کس اُمید پر تم سے ملے؟

نعیمہ۔ بھائی یہ بات تو تمھاری واجبی ہے کہ ہمیشہ سے امّاں جان مجھ کو بہت چاہتی ہیں لیکن خدا جانے کہ اُن کو کیا ہو گیا تھا کہ بے تحاشا مار بیٹھیں۔

صالحہ ۔ اچھا، پھر یوں ہی سمجھو کہ آدمی ہی تو ہیں؟ اُنھیں سے زیادتی ہو گئی سہی لیکن کیا انصاف ہے کہ اس ایک زیادتی کی وجہ سے اُن کی عمر بھر کی مہربانی اور شفقت اور عنایت اور رعایت اور دلسوزی اور ہمدردی اور خیر خواہی اور پرورش اور نفع رسانی ایک دَم سے سب پر پانی پھیر دیا جائے۔

نعیمہ ۔ مجھ کو رہ رہ کر اُن کا تھپڑ کمبخت یاد آتا ہے۔

صالحہ ۔ اس واسطے کہ تم نے اُن کے حقوق بُھلا رکھے ہیں۔

نعیمہ ۔ کیا تم سے اماں نے کہا ہے کہ سمجھا بُجھا کر نعیمہ کو خطا معاف کرانے کے لئے لوالاؤ؟

صالحہ ۔ ہرگز نہیں۔ اُن کو تمھاری خطا معاف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ نقصان تمھارا ہے یا اُن کا؟ اور شاید اُن کے دل میں یہ بات آئی بھی ہو تو تمھارے مزاج کو دیکھ کر بھلا اُن کو یہ توقع ہو سکتی ہے کہ تم خطا کا اقرار اور معافی کی درخواست کرو گی؟

نعیمہ ۔ بھلا اور جو میں گئی اور اماں جان مُنھ سے نہ بولیں تو مجھ کو اور شرمندگی ہو گی۔

صالحہ ۔ ممکن ہے کہ نہ بولیں، کیونکہ تمھاری خطا معمولی طور کی خطا نہیں ہے۔ مگر پھر وہ ماں ہیں، اور ماں بھی کیسی ماں بچوں پر خصوصاً تم پر دل سے فدا، جان سے قربان۔ شاید تم کو کوٹھری سے نکلتا ہوا دیکھ، عجب نہیں کہ دوڑ کر خود لپٹ جائیں اور تم کو مُنھ سے

کہنے کی بھی نوبت نہ آئے۔
نعیمہ۔ جی تو چاہتا ہے کہ جاؤں چلی بھی جاؤں مگر شرم آتی ہے۔ بھلا کل پر رکھیں تو کیسا؟
صالحہ۔ تم کو خدا کا ترس نہیں آتا کہ سارا گھر فاقے سے ہے رات بھر میں تمہارا اور اُن سب کا کیا حال ہو گا؟
نعیمہ۔ بھائی ہاتھ جوڑنے کو تو رہنے دو کھانا اپنے نام سے منگوا بھیجو۔
صالحہ۔ اجی مجھ سے کہو تو میں کھانے کو بھی رہنے دوں۔ بھوکی مرو گی تم یا تمہاری ماں بہنیں۔ مگر بے صفائی کھانے کا لطف نہیں۔ اِدھر تم افسردہ اُدھر وہ آزردہ۔ کھانا کیا خاک کھایا جائے گا۔ بس اتنی دیر کی بات ہے کہ تم کوٹھری کے باہر تک چلو۔
نعیمہ۔ بھائی بس زیادہ ہم کو دق مت کرو۔ کھانا منگوا دو میں کھا لوں گی۔
صالحہ۔ ہو تم اپنی ضد کی۔ کھانا کھاؤ گی تو کسی پر احسان کرو گی؟ کوٹھری کے باہر تک چلو تو البتہ میں جانوں کہ تم کو میری خاطر عزیز تھی۔
نعیمہ۔ چلو بس مجھ کو بچوں کی طرح مت پھسلاؤ۔ یہ بھی تمہاری خاطر ہے کہ میں من گئی۔ ورنہ نعیمہ بندی اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی ایک کی تو سنتی ہی نہیں۔

صالحہ - خاک مَن گئیں - پتھر مَن گئیں - میں اس کو منا منا نا نہیں سمجھتی - کیا کروں رات زیادہ گئی اور لوگ بھوک سے بدحواس ہیں ورنہ تم کو یہ دعویٰ ہے کہ میں کسی کی سنتی نہیں، اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ بات واجبی ہو تو کیا معنی کہ سننے والا اُس کو نہ تسلیم کرے اور دیکھو میری اس وقت کی بات یاد رکھنا کہ تم کو خالہ جان کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑیں گے۔

نعیمہ - خیر، جب پڑیں گے تب جوڑ بھی لیں گے۔

اس کے بعد صالحہ کوٹھری سے نکل دوسرے قطعہ میں خالہ کے پاس گئی۔ بہت سے لوگ سو گئے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ فہمیدہ اکیلی بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں نہیں معلوم کیا باتیں کر رہی تھی کہ صالحہ جاتے کے ساتھ ہی بولی " خالہ جان! مبارک، میرا اور آپا جان کا کھانا دیجئے۔" فہمیدہ سننے کے ساتھ چونک سی پڑی اور کہنے لگی۔ "سچ کہو"؟

بھانجی - آپ خود اُن کو کھاتے ہوئے دیکھ لیں تب تو سہی۔

خالہ - بھائی تم نے تو کمال ہی کیا - کیونکر منایا؟ کس طرح سمجھایا؟ مجھ کو تو امید نہ تھی کہ وہ کسی ڈھب سے سیدھی ہو گی؟ اُس کا غصہ ہے خدا کی پناہ، جیسے کسی کو جن چڑھتا ہے - نہیں معلوم تم نے کیا سحر[1] کیا کہ ایسے بھوت کو اُتارا[2]۔ ہم سب لوگ تو دن بھر ہلاک ہوئے کوئی حکمت نہ چلی کوئی تدبیر پیش رفت نہ ہوئی۔

صالحہ - میں تو اُن کو یہاں آپ کے پاس لاتی اور آپ کے

---

[1] جادو [2] غصہ کو ٹھنڈا کیا۔

پانوں پر ان کا سر رکھوا دیتی ۔ لیکن کیا کروں رات زیادہ گئی اور لوگ بھوک سے بیتاب ہیں ۔ خیر انشاء اللہ بشرطِ خیریت پھر دیکھا جائے گا ۔ لائیے کھانا نکالئے اور جاؤں حمیدہ کو بھی جگاؤں ہشیار کروں کہ اُس کا تو اور بھی بُرا حال ہوا ہو گا ۔

خالہ نے تو کھانا نکالا اور صالحہ نے جا حمیدہ کو اٹھا بٹھایا ۔ حمیدہ سوئی کیا تھی ضعف و ناتوانی کی غفلت میں پڑی ہاتھ پانوں توڑ رہی تھی ۔ صالحہ کی آواز سنتے ہی آنکھ کھولنے سے پہلے کھڑی ہو گئی اور بڑی بہن کو سلام کیا ۔ صالحہ نے پیار سے گلے لگا کر گودی میں لے لیا ۔ اور کہا حمیدہ اس قدر سویرے تم سو رہا کرتی ہو ؟

حمیدہ ۔ اماں جان سے پوچھ لیتی ہوں اور جب وہ کہہ دیتی ہیں کہ ہاں وقت آگیا تو نمازِ عشا پڑھ کر سو رہتی ہوں ۔

صالحہ ۔ تم نے کچھ کھانے کو بھی کھایا ؟

حمیدہ ۔ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہی ۔

صالحہ ۔ بھوک لگی ہے ؟

حمیدہ نے اُس کا بھی کچھ جواب نہ دیا ۔

صالحہ ۔ چلو ہم تم کھانا کھائیں ۔

حمیدہ ۔ اماں جان نے کھانا کھایا ؟

صالحہ ۔ اماں جان تمھارے ساتھ کھائیں گی ۔

حمیدہ ۔ اور ہماری آپا جان ؟

صالحہ - تم کو دُنیا جہان سے کیا مطلب؟ جس کو بھوک لگی ہو گی آپ کھالے گا۔

حمیدہ - ہے ہے - آپا جان نہ کھائیں اور ہیں کھالوں؟ اچھی! خدا کے لئے تم کسی طرح آپا جان کو سمجھاؤ - آج تمام دن اُنھوں نے کچھ نہیں کھایا۔ ننّا دودھ کے لئے پھڑک پھڑک کر آخر سو گیا۔

یہ کہہ کر حمیدہ رونے لگی تو صالحہ نے اُس کی تشفی کی کہ حمیدہ روست - آپا بھی کھائیں گی - غرض کوئی ڈیڑھ پہر رات گئے سب نے کھانا کھایا۔

صالحہ اور نعیمہ نے ایک ساتھ کوٹھری میں اور باقی سب لوگ اپنے اپنے دستور کے مطابق کھانا کھانے کے بعد سو سُلا رہے مگر صالحہ اور نعیمہ میں کچھ گفتگو کھانے کے بعد بھی ہوئی - خود ہی نعیمہ بولی "کیوں صاحب! اب تو آپ خوش ہوئیں - جو کچھ تم نے کہا میں نے کیا؟"

صالحہ - خوش تو میں تب ہی ہوتی کہ جب صفائی ہوگئی ہوتی -

نعیمہ - اچھی اب بھی صفائی میں کچھ باقی رہ گیا - رفتہ رفتہ دس پانچ دن میں بول چال بھی ہونے لگے گی -

صالحہ - دس پانچ دن؟

نعیمہ - اور کیا کل؟

صالحہ - ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ تم نے خود کہا تھا - کل پر رکھو -

نعیمہ - میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں کل بولنے بھی لگوں گی -

صالحہ۔ تو خاک بھی صفائی نہیں ہوئی۔

نعیمہ۔ کھانا میں نے کھایا۔ امّاں جان نے کھایا۔ حمیدہ نے کھایا۔ ننّا دیکھو دودھ پی ہی رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر صفائی کیا ہوگی؟

صالحہ۔ خیر یہ سری زبردستی سے تم سب نے ایک ایک دو دو نوالے کھا لئے۔ میں اس کو کھانا نہیں سمجھتی۔ دودھ پلانے والی عورت بھلا کچھ نہ کھائے۔ تب بھی چار چپاتیاں تو کھائے۔ تم نے پاؤ ٹکڑا بھی نہیں کھایا۔ چاولوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تمھارے سبب میں بھی بھوکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سمجھتی تھی کہ خیر صبح کو اس کی کسر نکل جائے گی۔ سو تم نے ابھی سے اُمید توڑ دی۔

نعیمہ۔ سچ تو یہ ہے کہ اب اس گھر میں مجھ کو اپنا گزر ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ اور اب میرا جی لگنا بھی مشکل ہے۔

صالحہ۔ کیوں؟

نعیمہ۔ میں نے تم سے کہا نہیں کہ یہاں تو ایک مہینہ پہلے سے ابّا کا مزاج، امّاں کے تیور۔ گھر کا رنگ ڈھنگ سب کچھ بدلا ہوا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ابھی تک نماز روزے کا تذکرہ نہیں کیا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ جب بڑے بھائی تک نوبت پہنچ گئی تو بھلا میں بیچاری کس گنتی میں ہوں۔ وہ اللہ رکھے اوّل تو مرد۔ دوسرے سب میں بڑے۔ تیسرے خدا کے فضل سے چنداں ان کے محتاج و دست نگر بھی نہیں۔ آج الگ ہو جائیں تو اُن کی پلاؤ کی رکابی کہیں

نہیں گئی۔ جس رجواڑے میں جا گھڑے ہوں گے اپنی شاعری کے ہنر سے مصاحب یا ناظم یا چکلہ دار ہو جائیں گے۔ رہیں بد نصیب ایک تو پردے کی بیٹھنے والی دوسرے ایسا کوئی ہنر نہیں آتا کہ چار پیسے کا سہارا ہو۔ اس روز بد کی کیا خبر تھی ورنہ آنکھوں دیکھتے دیکھتے ساتھ والی لڑکیاں کیسے کیسے کام سیکھ گئیں کہ ہنر کی بدولت گھر بیٹھے بادشاہت کر رہی ہیں مجھ کو کہیں اپنا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ ماں باپ کے گھر ایسی پڑی ہوں جیسے گلی میں کُتّا۔ خدا واسطے کو کسی نے ٹکڑا ڈال دیا کھا لیا۔ ورنہ میرا کیا زور اور کون دعوی۔ ابّا جان تو پہلے ہی سے کچھ واسطہ دسر دکار نہیں رکھتے۔ لڑکیوں سے بولنے اور بات کرنے کی اُن کی عادت نہیں۔ امّاں جان کا ایک سہارا تھا سو اُنھوں نے ایسی دست درازی شروع کی کہ اب خُدا ہی اُن کے ہاتھ کو روکے گا تو رُکے گا۔ ورنہ چھوڑا تو ہے ہی۔

صالحہ۔ آپا! تم اس قدر بیدل کیوں ہوئی ہو؟ کیا نماز کچھ ایسا بڑا مشکل کام ہے کہ اُس کی وجہ سے یہ تمام دقتیں تم کو پیش آئی ہوئی معلوم ہوتی ہیں؟

نعیمہ۔ بُوا میں تو ہنسی دل لگی کی آدمی ہوں بھلا مجھ سے یہ اوگھنی اُداس زندگی کاہے کو نبھے گی۔ لڑائی تو خیر آج ہوئی ہے۔ میرا تو کئی دن سے جی گھبرا رہا تھا۔

صالحہ۔ پھر آخر تم نے تدبیر کیا سوچی ہے؟

نعیمہ۔ ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ میں تمھارے

یہاں چلی جاؤں۔

صالحہ یہ سُن کر چپکی ہوئی اور دیر تک چُپ رہی۔

تو نعیمہ بولی "تم تو سُن کر ایسا دم بخود ہوئیں کہ گویا میں سچ مچ تمھارے گھر جا رہی ہوں۔ ڈرومت۔ میں نے تو تمھاری محبّت آزمانے کے لئے ایک بات کہی ورنہ میں نہ کہیں آؤں نہ جاؤں۔ یہ تو کیا اس سے بھی زیادہ مصیبت ہو تو میں دوسرے کا احسان نہ اُٹھاؤں۔"

صالحہ۔ یہ تو تم نے کوئی نرالی ادا سیکھی ہے۔ چھیڑ چھیڑ کر لڑنا۔ گھر جیسے میرا ویسے تمھارا۔ جن کا گھر ہے میں اُن کی بیٹی اور تم بیٹیوں سے بڑھ کر۔ جاؤگی تو اپنی خالہ کے گھر جاؤگی۔ اور احسان اُٹھاؤگی تو اپنی خالہ کا اُٹھاؤگی۔ میں تم کو لے جانے والی کون اور منع کرنے والی کون؟

نعیمہ۔ اچھا تو میں پوچھتی ہوں اگر میں چلی جاؤں تو خالہ جان کیا کہیں گی؟

صالحہ۔ جو میں کہتی ہوں۔ جو تمھاری امّاں کہتی ہیں وہی خالہ جان کہیں گی وہی ہر شخص کہے گا، جو سنے گا۔ کیا خالہ جان دُنیا سے باہر یا انوکھی ہیں؟

نعیمہ۔ اجی گھر سے تو نہ نکال دیں گی؟

صالحہ۔ یہاں تم کو گھر سے کوئی نکال رہا ہے جو ہاں سے خدانخواستہ نکال دے گا۔ آپا! نہیں معلوم تم اب کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ ایک امّاں سے کیا لڑیں سارے کُنبے کو دشمن ٹھہرالیا۔

نعیمہ۔ لیکن خالہ جان بیچاری غریب آدمی ہیں۔ کہاں سے میرا خرچ اٹھائیں گی۔

صالحہ۔ اب ایسی بھی گئی گزری ہوئی نہیں ہیں کہ مہینے بیس دن تم کو نہیں رکھ سکتیں۔

نعیمہ۔ مہینہ بیس دن کیسا، میں تو ساری عمر کے لئے جاتی ہوں۔

صالحہ۔ خدا نہ کرے کہ تم ساری عمر خالہ کے یہاں پڑی رہو۔ اللہ تم کو اپنے گھر آباد کرے اور تمھاری ماں کا کلیجہ تم سے ٹھنڈا ہو۔

نعیمہ۔ میں بھی یہی سوچ کر جاتی ہوں کہ چند روز وہاں رہوں گی تو اماں جان کو بھی لڑائی جھگڑے کی باتیں بھول بسر جائیں گی پھر بلوا بھیجیں گی تو چلی آؤں گی۔

صالحہ۔ میرے نزدیک بھی جانے میں کچھ قباحت کی بات نہیں مگر اپنی اماں جان سے اجازت لے لو۔

نعیمہ۔ کیونکر پوچھوں؟

صالحہ۔ یہ بھی کوئی بڑا مشکل کام ہے۔ ابھی اُن کے پاس چلی جاؤ اور جا کر کہو کہ "میں خالہ جان کے یہاں جاتی ہوں" وہ کہہ دیں گی، اچھا۔

نعیمہ۔ سچ کہنا۔ کہیں چلی نہ جاؤں۔ اتنا کام تم نہیں کر دیتیں۔

صالحہ۔ نہیں میں نہیں کرتی۔

نعیمہ۔ ہماری بہن نہیں؟

صالحہ۔ نہیں میں بہن بھی نہیں بنتی۔ بی بی صاحب کو اتنا

سمجھایا خاک بھی اثر نہ ہوا۔

نعیمہ ۔ نوج کوئی ایسا بے مروّت ہو۔

صالحہ ۔ تم سے بھی بڑھ کر۔

نعیمہ ۔ اچھی میری بہن۔

صالحہ ۔ خیر میں پوچھ دوں گی۔ لیکن کیا تم خالہ جان سے رخصت ہو کر نہ چلو گی اور چلتے وقت اُن سے نہ ملو گی؟

نعیمہ ۔ اُس وقت جیسی ہو گی دیکھی جائے گی۔

صالحہ ۔ سُنو بُوا اگر تمھارے دل میں دغا ہو تو پہلے سے کہہ دو، ایسا نہ ہو میں پوچھنے جاؤں اور تم بے ملے چل دو۔ ناحق مجھ کو شرمندگی ہو۔

نعیمہ ۔ نہیں میں نے تمھارے چھیڑنے کو کہا تھا۔ بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چلتے وقت میں اماں جان سے نہ ملوں۔ تو جاؤ پوچھ آؤ۔

صالحہ ۔ اس وقت رات زیادہ گئی ہے۔ آخر صبح کی نماز میں خالہ جان کے ساتھ پڑھوں گی۔ اُسی وقت پوچھ دوں گی۔

نعیمہ ۔ اچھا، پھر ڈولیوں کو تو اڈے پر اسی وقت کہلا بھیجو۔ ورنہ شاید وقت پر نہ ملیں۔

صالحہ ۔ نہ ملیں گی تو ہمارے محلے سے آجائیں گی۔

نعیمہ ۔ اس میں دیر ہو گی۔

صالحہ ۔ کیا شادی میں جا رہے ہیں کہ دیر ہو گی تو دُلھن رخصت ہو جائیگی؟

نعیمہ ۔ نہیں، چلنا ہے تو بس منھ اندھیرے چل دیں۔

ننا ڈولی میں ڈرتا ہے۔

صالحہ۔ خیر اسی وقت کہلا دیا جائے گا۔

اس کے بعد نعیمہ اور صالحہ دونوں سو رہیں۔ ابھی تارے چھٹکے ہوئے تھے کہ صالحہ اپنے معمول پر نماز صبح کے واسطے اٹھی اور نعیمہ اس وقت غفلت کی نیند میں پڑی سو رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر صالحہ خالہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور کہا کہ بس خالہ جان اب میں جاؤں گی۔

خالہ۔ ایں! ایسی جلدی ع

تم آگ لینے آئی تھیں۔ کیا آئیں، کیا چلیں؟

صالحہ۔ دس پندرہ دن بعد پھر آجاؤں گی۔

خالہ۔ ذرا نعیمہ کے مزاج کو ٹھکانے لگنے دیا ہوتا۔

صالحہ۔ وہ بھی تو میرے ساتھ جانے کو کہتی ہیں۔

خالہ۔ سچ کہو۔

صالحہ۔ مجھ سے کہہ بھی دیا ہے کہ تم پوچھ لو۔

خالہ۔ اُسی کی مرضی ہے یا تم نے صلاح دی ہے؟

صالحہ۔ خود اُنھیں کی مرضی ہے۔

خالہ۔ بھلا کچھ یہ بھی کہتی تھیں، کتنے دن کے واسطے؟

صالحہ۔ دنوں کی تعیینؔ[1] تو مجھ سے نہیں بیان کی۔

خالہ۔ خیر اُس نے دنوں کی تعیین نہیں کی تو میں تم سے کہے دیتی ہوں

---

[1] تعداد مقرر۔

کہ آٹھ دن سے زیادہ مت رکھنا۔ ہماری بہن بیچاری غریب آدمی ہیں۔ اُن کو تکلیف ہو گی۔

صالحہ۔ اب جب تک اُن کا جی چاہے۔

خالہ۔ تم لئے تو جاتی ہو مگر اتنا تو کرنا کہ اُس کو بھی نیک ہدایت دینا۔

صالحہ۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا سمجھاؤں گی اور اُن کو مولویوں کے وعظ سنواؤں گی۔ خدا کی ذات سے اُمید تو ہے کہ ضرور اثر ہو گا۔

اس کے بعد صالحہ نے گھر کے نوکروں سے پوچھا کہ ڈولیوں کے واسطے رات کو جو کہلا بھیجا تھا۔ آئیں یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ ڈولیاں تو آپ سے پہلے کی دروازے پر لگی ہوئی ہیں۔ تب صالحہ کوٹھری کی طرف چلی۔ اس غرض سے کہ نعیمہ کو جگائے اور اجازت کی خوشخبری سنائے۔ دیکھا تو نعیمہ پلنگ پر نہیں۔ سمجھی کہ دوسرے قطعے میں بچّے کا مُنھ دُھلاتی ہوں گی۔ مگر وہاں بھی نعیمہ کو نہ پایا۔ معلوم ہوا کہ جب صالحہ خالہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی نعیمہ چپکے سے اُٹھ، بچّے کو لے، کھڑکی کی راہ ہو کر ڈیوڑھی میں جا، سوار ہو، بے رخصت ہوئے چلدیں۔ اب یہ کیا موقع تھا کہ ڈولی واپس منگالی جائے۔ ناچار صالحہ اکیلی خالہ کو سلام رخصت کرنے لگی تو خالہ نے کہا "اے لڑکی ایسی کیا بھاگڑ پڑی ہے؟ نعیمہ کو اُٹھنے دو۔ ناشتہ کھا پی لو۔ تب جانا۔

صالحہ۔ آپا تو گئیں بھی۔

خالہ۔ یہ کب؟۔

صالحہ - جس وقت میں بعد نماز آپ سے باتیں کر رہی تھی اُسی وقت وہ سوار ہو گئیں۔

خالہ - کیسی چپکے سے نکل گئی کہ میں نے اُسے جاتے بھی نہ دیکھا۔

صالحہ - کھڑکی کی راہ سے گئیں۔

خالہ - تب ہی۔ مگر صالحہ تم نے دیکھا اس کا غصہ۔ کتنا تم نے اس کے ساتھ سر مارا۔ میں باہر کھڑی ہوئی تمھاری ساری باتیں سنتی تھی لیکن اُس کا یہ اثر ہوا کہ بے ملے چلدیں۔ بھلا کہیں ایسا بھی غضب ہوا ہے کہ بیٹی ماں کے گھر سے یوں چلی جائے اگر میں اس کی باتوں پر جاؤں تو جیتے جی صورت نہ دیکھوں۔ لیکن کیا کروں یہ دل کمبخت نہیں مانتا۔ اس مزاج کی بدولت ان حالوں کو تو یہ پہنچ گئی۔ مگر ذرا اس کو خیال نہیں۔ مطلق اس کو پروا نہیں۔ دیکھئے کیا اس کی تقدیر میں لکھا ہے۔ کیا اس کے نصیب میں بدا ہے۔ اس کے غم نے مجھ کو تو کھالیا اور میں اس کے سوچ میں تمام ہو گئی۔

صالحہ - آپ رنج نہ کیجئے اور دل کو سنبھالئے۔ اب آپ نے ان باتوں کا خیال کیا ہے تو انشاءاللہ رفتہ رفتہ سب درست ہو جائیں گی یہی ہے کہ کوئی اویر کوئی سویر۔

اب ہم نعیمہ کو اسی جگہ چھوڑتے ہیں۔ جو اُس کو پیش آیا اور جیسا اُس کا انجام ہوا، پھر بیان کریں گے۔

۵۹

فصل نہم

کلیم باپ سے ناخوش ہوکر گھر سے نکل گیا
نصوح نے کلیم کا تکلّف خانہ اور بیہودہ کتاب خانہ جلا دیا

نعیمہ تو صبح ہوتے گئی مگر کلیم رات ہی کو گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جب صالحہ ڈولی سے اُتری، لوگ اُس سے ملنے ملانے میں مصروف ہوئے کلیم آنکھ بچی تو دروازہ کھول باہر۔ اتنا بھی تو نہ کیا کہ رات کا وقت ہے لاؤ کسی سے دروازے کے واسطے تو کہتا جاؤں۔ جب نعیمہ کو کھانا جالیا سب گھر والے کھا پی کر فارغ ہو گئے اور فہمیدہ سونے کے ارادے سے مکان میں آئی تو دیکھا کہ باہر کا دروازہ چوپٹ کھُلا پڑا ہے۔ کلیم کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ کہیں پتہ نہیں۔ سمجھی کہ موقع پا کر چلدیا لیکن اُس وقت نہ تو کلیم اس ارادے سے گیا تھا کہ پھر نہ آئے۔ اور نہ فہمیدہ کو ایسا گمان ہوا رات گئی تھی زیادہ بات کا چرچا کرنا مناسب نہ جان کر سب لوگ سو سلا رہے نصوح نماز صبح پڑھ کر مسجد سے واپس آرہا تھا کہ اُس کو گلی کے نکّڑ پر نعیمہ کی اور ڈیوڑھی سے نکلتی ہوئی صالحہ کی ڈولی ملی۔ کلیم کی نافرمانیوں پر غصّہ تو اُسے رات ہی بہتیرا اُچھ آیا اور بار بار اُس کے دل نے چاہا کہ

اُسی وقت اِدھر یا اُدھر جو کچھ ہو فیصلہ کر دے لیکن چند در چند باتوں کے لحاظ سے وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر چپ ہو رہا اور مشکل سے اپنی طبیعت کو اس بات پر رضامند کیا کہ پیام زبانی کا اثر اور تحریر کا نتیجہ تو معلوم ہوا ایک مرتبہ اور رد و در رد و کہہ کر بھی دیکھ لو اس پر بھی نہ سمجھے تو اپنا سر کھائے اس ارادے سے پہلے وہ مردانے مکان میں آ کر ٹھہرا اور جب کلیم اس کو نظر نہ آیا تو اُس نے نوکروں سے پوچھا مگر کسی نے جواب صاف نہ دیا۔ تب وہ نوکروں پر خفا ہوا کہ تم لوگ کیسے نالائق ہو کہ مجھ کو اس بدبخت کا ٹھیک پتہ نہیں دیتے تم اپنے پندار میں اُس کے حق میں خیر خواہی کر رہے ہو۔ مگر میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمھاری رازداری نہ صرف اس کم نصیب کے حق میں زبوں ہے۔ تمھارے حق میں بھی اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی عادت اس قدر سویرے اُٹھنے کی نہیں ہے۔ ضرور ہے کہ تم نے اس کو جگا کر کہیں ٹال دیا ہے۔ میں نے تم کو اپنی آسائش کے لئے خاص خاص خدمتوں پر مامور کر رکھا ہے اگر تمھاری وجہ سے میرے انتظام خانہ داری میں خلل واقع ہو تو تم میرے نوکر نہیں ہو بلکہ دشمن ہو۔ ملازم نہیں ہو بلکہ بدخواہ ہو۔ اگر میں اُس ناشدنی کو فرزندی سے عاق کروں گا تو تم سب کو بھی اُس کے ساتھ نوکری سے برطرف۔

نصوح کا یہ کلام سن کر اعلیٰ ادنیٰ سب نوکر تھرا اُٹھے اور جوان میں سب سے زیادہ سلیقہ مند تھا دست بستہ ہو کر بولا "حضور کا عتاب غلاموں کے سر و چشم پر، مگر شب کو مکان زنانہ رہا اور خانہ زادوں کو اجازت

ہوئی کہ اپنے اپنے گھر جا کر سوئیں ۔ اُس وقت تک صاحبزادے صاحب گھر میں تشریف رکھتے تھے ۔ نمک خواروں نے[1] سچ کو اگر اُن کا جمال نہیں دیکھا۔ جناب بیگم صاحب۔ سے حضور اس کا حال دریافت فرمائیں ۔ خانہ زادوں سے ایسی کورنمکی نہ ہوگی کہ حضور سے کوئی بات مخفی رکھیں"۔

یہ سُن کر نصوح اندر گیا اور حسب عادت، سب لوگ سلام صبح کرنے کے واسطے جمع ہو گئے ۔ فہمیدہ اس وقت تک تلاوت میں مصروف تھی مگر تھوڑی دیر میں فارغ ہو گئی تو نصوح نے کہا "کیوں صاحب بی صالحہ گئیں؟

فہمیدہ ۔ کبھی کی گئیں ۔ اب تک تو وہ گھر بھی پہنچ گئی ہوں گی ۔

نصوح ۔ اور دوسری ڈولی کس کی تھی؟

فہمیدہ ۔ تمہاری بڑی صاحبزادی کی ۔

نصوح ۔ مَن کر گئیں یا بگڑ کر؟

فہمیدہ ۔ کچھ مَن کر، کچھ بگڑ کر ۔

نصوح ۔ یہ کیا؟

فہمیدہ ۔ صالحہ نے، خدا اُس کو جزائے خیر دے بہت کچھ سمجھایا اور آدھی رات تک اپنا سر خالی کیا ۔ بارے اُس کے کہنے سے اُنھوں نے اپنا قہری روزہ تو افطار کیا لڑکے کو دودھ بھی پلایا یہ تو اُن کا منّنا تھا۔ بگڑنا یہ کہ صبح کو بے ملے بے رخصت ہوئے ڈولی میں بیٹھ چلدیں میں صالحہ سے باتیں کرتی رہی ۔ میں نے اُس کو جاتے بھی نہ دیکھا۔

---

[1] نمک حرامی ۔

نصوح۔ خیر، اُن سے تو خدا نے سبکدوش کیا۔ اب صاحبزادے صاحب کی کہو وہ کہاں ہیں؟

سب چھوٹے بڑوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ہم کو مطلق خبر نہیں۔

نصوح۔ کب سے غائب ہیں؟

فہمیدہ۔ مغرب کے بعد سے برابر میرے پاس بیٹھا تھا۔ میں اس کو سمجھاتی رہی۔ تمھارا خط آیا اُس کو پڑھا۔ اتنے میں صالحہ کی ڈولی آپہنچی۔ میں اُس سے باتیں کرنے لگی۔ پھر لوگوں کو کھانا دیا دلایا۔ اُس میں کوئی پہر ڈیڑھ پہر رات چلی گئی۔ سونے کو جو گئی تو دیکھا کہ مکان خالی پڑا ہے۔

نصوح۔ الحمد للہ خس کم جہاں پاک[1]۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اس میں کس کی خطا ہے؟ میری یا اُس کی۔

فہمیدہ۔ خطا صریح اُسی کی ہے۔ میں خواہ مخواہ بھی تمھاری خطا بتا دوں۔ تم نے اُس کو ایک دفعہ چھوڑ دو دفعہ بُلایا۔ خط لکھا۔ بس حد ہو گئی۔ علیم نے بہتیرا سمجھایا۔ میں نے بہت کچھ کہا سُنا۔ وہ اپنی شاعری کے آگے کس کی سُنتا ہے۔ تم تک جانے ہی کی اُس نے ہامی نہ بھری۔ میں نے کہا تھا کہ کھانے پینے سے فراغت ہو کر پھر اُس کے ساتھ سر ماروں گی، اسی غرض سے مردانے مکان میں پردہ کرایا۔ مگر وہ پہلے ہی سے نکل گیا۔ کوئی کیا کرے اپنی اپنی قسمت اپنی اپنی تقدیر۔

[1] کوڑا کرکٹ کم ہوا تو جہاں صاف ہوا۔

نصوح ۔ جس طرح یہ نالایق میرے ساتھ پیش آیا ۔ نعیمہ نے تمھارے ساتھ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا ۔

اس کے بعد نصوح نے منجھلے بیٹے علیم سے کہا بھلا تم نے اُس کے بچھونے یا کتابوں میں تو دیکھا ہوتا ۔ شاید وہ کچھ لکھ کر رکھ گیا ہو، افسوس ہے کہ اُس کے نفس سرکش نے اُس کو مجھ تک نہ آنے دیا ورنہ میں تو ہر طرح اُس کے عذرات کو سننے اور اُس کے وجوہات پر لحاظ کرنے اور معقولیت کے ساتھ اُس کو سمجھانے کے لئے موجود تھا ۔

علیم ۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں گزری مگر میں اب اُن کی چیزوں میں دیکھے لیتا ہوں ۔ اگرچہ مجھ کو اب بھی ایسی امّید نہیں ہے کہ وہ کچھ لکھ کر رکھ گئے ہوں کیونکہ اگر لکھنا ہی منظور ہوتا تو وہ آپ کے خط کا جواب ہی نہ دیتے ۔ دوسرے اُن کو اتنی فرصت کہاں ملی ۔ کل شام کو اس بات کا چرچا شروع ہوا اور میں جانتا ہوں کہ صالحہ کے آتے ہی وہ تشریف لے گئے ۔ اس اثنا میں برابر میں اُن کے پاس تھا اور میرے چلے جانے کے بعد امّاں جان ۔

نصوح ۔ پھر بھی اُس کو داخل اتمام حجّت سمجھ کر چاہتا ہوں کہ احتیاطاً اُس کی چیزوں میں دیکھ لیا جائے ۔ چلو میں بھی تمھارا شریک رہوں گا ۔

باہر مردانے میں آکر نصوح نے نوکروں سے پوچھا کہ کلیم کا اسباب کس جگہ رہتا ہے ۔

نوکر۔ حضور، صاحبزادے صاحب نے دو کمرے رکھے ہیں۔ اس دکھن والے کمرے کا نام اُنھوں نے (بچے ہی تو ہیں) عشرت منزل رکھ چھوڑا ہے۔ جب اُن کے ہمجولی آتے ہیں تو سب اسی کمرے میں بیٹھ کر کھیلا اور باتیں کیا کرتے ہیں۔ اُتر والے کمرے کو خلوت خانہ فرمایا کرتے ہیں۔ اُس میں اُن کے پڑھنے لکھنے کی کتابیں وغیرہ ہیں۔

نصوح۔ عشرت منزل اور خلوت خانہ کا نام سُن کر چوکنّا ہوا اور اُس نے نوکروں سے کہا کہ اچھا پہلے اس عشرت منزل کو کھولو، چنانچہ عشرت خانہ کھولا گیا۔ تو ایک تکلف خانہ تھا۔ کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش، اُس پر دری، اُس پر سفید چاندنی۔ اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبّے یا سلوٹ کا نام نہیں۔ صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوا۔ گاؤتکیہ لگا ہوا۔ سامنے اُگالدان۔ لبِ قالین پیچوان۔ چوکیوں کے گرداگرد کرسیاں تھیں تو لکڑی کی لیکن آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی۔ چھت میں پٹاپٹی کی گوٹ کا پنکھا لٹکا ہوا ہلانے کے واسطے نہیں بلکہ دکھانے کے لئے۔ اُس کے پہلوؤں میں جھاڑ۔ جھاڑوں کے بیچ بیچ میں رنگ برنگ کی ہانڈیاں۔ چھت کیا تھی بلامبالغہ آسمان کا نمونہ تھا جس میں پنکھا بجائے کہکشاں کے تھا۔ جھاڑ بمنزلہ آفتاب اور ماہتاب اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے۔ چھت کے مناسب حالت دیواریں۔ تصویروں اور قطعات اور دیوارگیریوں سے آراستہ تھیں۔ نصوح اس سازوسامان کو تھوڑی دیر ایک سکتے کے

عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد ایک آہ کھینچ کر بولا کہ افسوس کتنی دولت خداداد اس بیہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں ضائع کی گئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں کی کار برآری میں صرف کیا جاتا۔ اس کے بعد اُس کی نگاہ مقابل صدر پر جا پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ آمنے سامنے دو میزیں لگی ہیں، ایک پر گنجفہ۔ شطرنج۔ چوسر۔ تاش۔ کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے تھے۔ دوسری پر گلدان اور عطر دان وغیرہ کے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب۔ نصوح نے نہایت شوق سے اُس کتاب کو کھولا، وہ تصویروں کا البم تھا۔ مگر تصویریں کسی عالم۔ حافظ۔ درویش۔ خدا پرست کی نہیں۔ نکھوا۔ پکھاوجی۔ تان رس خاں گویا۔ میر ناصر احمد بین نواز۔ صمد خاں پہلوان۔ کھلونا بھانڈ۔ حیدر علی قوال۔ نتھو ہیجڑا۔ قاری علی محمد بھکڑ۔ عدو جواری اس قسم کے لوگوں کی۔ شیشہ آلات کی وجہ سے نصوح نے دیوار والی تصویروں کو بغور نہیں دیکھا تھا۔ اب البم کو دیکھ کر اُسے خیال آیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ تصویریں اور بھی بیہودہ تھیں۔ قطعے اور طغرے اگرچہ اُن کا سوادِ خط پاکیزہ تھا مگر مضمون و مطلب دین کے خلاف، مذہب کے برعکس۔ نصوح نے وہیں سے ایک میر فرش اٹھا کر ان سب کی خبر لینی شروع کی اور بات کی بات میں کل چیزوں کو توڑ پھوڑ برابر کیا اور جو کچھ باقی رہا اُس کو صحن میں رکھ آگ لگا دی اور نوکروں کو حکم دیا کہ اچھا اب خلوت خانہ کھولو۔ اُس میں تکلف کے

معمولی ساز و سامان کے علاوہ کتابوں کی ایک الماری تھی۔ دیکھتے ہیں تو اتنی جلدیں تھیں کہ انسان اُن کی فہرست لکھنی چاہے تو سارے دن میں بھی تمام نہ ہو۔ لیکن کیا اردو، کیا فارسی، سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں۔ چھوٹے قصے۔ بیہودہ باتیں۔ فحش مطلب۔ نیچے مضمون اخلاق سے بعید۔ حیا سے دُور۔ نصوح اُن کتابوں کی عمدگی۔ خط کی پاکیزگی۔ کاغذ کی صفائی۔ عبارت کی خوبی۔ طرزِ ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تھا تو کلیم کا کتاب خانہ اُس کو ذخیرۂ بے بہا معلوم ہوتا تھا مگر معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی[1] اور دریدنی[2] تھی۔ اسی تردد میں اس کو دوپہر ہوگئی۔ کئی مرتبہ کھانے کے لئے گھر سے اُس کی طلب ہوئی مگر اُس کو فرصت نہ تھی۔ بار بار کتابوں کو اُلٹ اُلٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ رکھ دیتا تھا۔ آخر یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلا دینا ہی بہتر ہے چنانچہ بھری الماری کتابیں لکڑی اُپلے کی طرح اوپر تلے رکھ آگ لگا دی۔ نصوح کا یہ برتاؤ دیکھ کر اندر سے باہر تک تہلکہ اور زلزلہ پڑ گیا۔ علیم دَوڑا دَوڑا جا اپنا "کلیاتِ آتش" اور دیوانِ شرر" اٹھا لایا اور باپ سے کہا کہ "جناب میرے پاس بھی یہ دو کتابیں اسی طرح کی ہیں"۔ نصوح نے ان کتابوں کو بھی دو چار جگہ سے کھول کر دیکھا اور کہا کہ واقع میں ان کے مضامین بھی جہاں تک میں دیکھتا ہوں بُرے اور بیہودہ ہیں۔ لیکن تمہاری نسبت مجھ کو خدا کے فضل سے اطمینان ہے چاہو تو اپنی کتابوں کو رہنے دو اگرچہ ان کا

[1] جلانے کے قابل۔ [2] پھاڑنے کے قابل۔

مطالعہ بھی میرے نزدیک خالی از معصیت نہیں ہے۔

علیم۔ کتاب جبکہ دیکھنے اور پڑھنے کے لائق نہیں تو اُس کا رکھنا بے سود بلکہ خطرناک ہے بہتر ہوگا کہ ان کو بھی جلا دیا جائے۔

نصوح۔ شاید تم میری خاطر سے کہہ رہے ہو اور تم کو پیچھے تاسف ہو۔

علیم۔ مجھ کو ہرگز تاسف نہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی نہ جلائی جائے وہ عمدہ نصیحت کی کتاب جو مجھ کو پادری صاحب نے دی تھی، اور رہیں یہ خرافات میں جانتا ہوں کہ بھائی جان کی کتابوں پر یہ اُسی پادری صاحب والی کتاب کا وبال پڑا۔ ڈرنے کا مقام اور عبرت کی جگہ ہے،

نصوح۔ لیکن کیا ضرور ہے کہ تمھاری کتابیں بھی اُس وبال میں داخل ہوں۔

علیم۔ ان کے نام بھی جلنا پکارتے ہیں ارشاد ہو تو جھونک دوں۔

نصوح۔ تمھاری یہی مرضی ہے تو بسم اللہ۔

علیم نے آتش کو دہکتی آگ اور شرر کو جلتے انگاروں میں پھینک دیا، علیم کی دیکھا دیکھی میاں سلیم نے بھی واسوخت امانت لا، باپ کے حوالے کی اور کہا کہ "ایک دن کوئی کتاب فروش کتابیں بیچنے لایا تھا بڑے بھائی جان نے "فسانۂ عجائب" "قصۂ گل بکاؤلی" "آرائش محفل" "مثنوی میر حسن" "مضحکات نعمت خان عالی" "منتخب غزلیات جرکین" "ہزلیات جعفر زٹلی" "قصائد ہجویہ مرزا رفیع السودا" "دیوان جان صاحب" "بہار دانش باتصویر" "اندر سبھا" "دریائے لطافت میر انشاء اللہ خاں" "کلیات رند" وغیرہ

بہت سی کتابیں اُس سے لی تھیں "۔ میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر بولے "کیوں سلیم! تم بھی کوئی کتاب لو گے؟

میں۔ جو آپ تجویز فرمائیں۔

بھائی جان۔ کون سی کتاب تم کو لے دوں؟ یہ کتابیں جو میں نے لی ہیں۔ اول تو میرے شوق کی ہیں دوسرے تم کو ان کا مزا نہیں ملے گا۔ کتاب والے کی ساری گٹھڑی میں سے یہ واسوخت اور "دیوان نظیر اکبر آبادی" دو کتابیں انھوں نے میرے لئے نکالیں اور کہا کہ واسوخت تو خیر، مگر یہ دیوان بڑی عمدہ کتاب ہے۔ میاں ہُدہُد کے اشعار آج تک کسی نے جمع نہیں کئے تھے۔ اس کے حاشیہ پر وہ بھی ہیں۔ چونکہ بھائی جان نے دیوان کی بہت تعریف کی تھی میں نے اُس کو نہایت شوق سے کھولا تو پہلے ہی چوہوں کا اچار نکلا۔ اُس کے مضمون سے میری طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ میں نے دونوں کتابیں پھیر دیں مگر بھائی جان نے یہ واسوخت زبردستی میرے سر مڑھی۔ ایک دن اتفاق سے حضرت بی کے بڑے نواسے نے اس کو میرے جزدان میں دیکھ کر پوچھا کہ "اہا! میاں سلیم! تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔

میں۔ کیوں؟

حضرت بی صاحب کا نواسہ۔ تم کو ایسی کتابوں کا بھی شوق ہے؟

میں۔ مجھ کو بھائی جان نے لے دی ہے۔ کیوں کیا یہ کتاب اچھی نہیں؟

حضرت بی صاحب کا نواسہ - اچھی بُری تو میں نہیں جانتا لیکن
اگر نانی اماں دیکھ پائیں گی تو شاید ہم لوگوں کو تمھارے پاس اٹھنے بیٹھنے کی
ممانعت کریں - بھلا کوئی ایسی گندی باتوں کی کتاب بھی پڑھتا ہے -
تب سے میں نے اس کتاب کو لا کر ردّی میں ڈال دیا تھا - آج
مجھ کو یاد آ گئی تو میں نے کہا یہ بھی اپنی مراد کو پہنچ جائے -
جب کلیم کا خرمنِ عیش و عشرت جل بُھن کر خاک سیاہ ہو گیا تو
نصوح اندر گھر میں گیا اور بیوی نے اس سے پوچھا کیوں جس پرچے
کی جستجو تھی ملا؟
نصوح - نہیں پرچہ تو نہیں ملا لیکن میرا مطلب حاصل ہو گیا -
فہمیدہ - وہ کیا؟
نصوح - مجھ کو اس بات کی تلاش تھی کہ کلیم کے دلی خیالات
معلوم کر لوں کہ آخر اُس کو جو اس قدر گریز ہے کہ میرے پاس تک آنے
سے بھی اُس نے انکار کیا تو اُس کی وجہ کیا ہے؟
فہمیدہ - پھر تم نے کیا وجہ دریافت کی؟
نصوح - وجہ کیا دریافت کی - اُس کی ساری حقیقت معلوم
ہو گئی بلکہ شاید رُو در رُو گفتگو کرنے سے بھی یہ بات پیدا نہ ہوتی جو مجھ کو
اب حاصل ہے
فہمیدہ - آخر کچھ میں بھی تو سُنوں؟
نصوح - میں نے اُس کے عشرت منزل اور خلوت خانہ کو دیکھا

اور اُس کے کتاب خانہ کی سیر کی۔

فہمیدہ۔ عشرت منزل اور خلوت خانہ کیسا؟

نصوح۔ تم تو کچھ مجھ سے بھی زیادہ بیخبر ہو۔ آج تک تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ صاحبزادہ بلند اقبال نے دو کمرے اپنے واسطے خاص کر رکھے ہیں ایک کا نام عشرت منزل رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے کا خلوت خانہ جس کمرے میں اُن کے شیاطین[1] الانس جمع ہوتے ہیں وہ عشرت منزل اور جہاں استراحت[2] فرماتے ہیں وہ خلوت خانہ اور اُسی خلوت خانہ میں کتاب خانہ بھی ہے۔

فہمیدہ۔ اتنی بات تو میں بھی جانتی ہوں کہ کلیم نے دو کمرے لے رکھے ہیں۔ مگر عشرت منزل اور خلوت خانہ میں نے آج ہی سُنا ہے۔

نصوح۔ تم نے اُن کمروں کو اندر سے بھی دیکھا۔

فہمیدہ۔ نہیں مردانے میں کبھی کاہے کو جانے کا اتفاق ہوتا ہے کل رات البتہ علیم کے اصرار سے پردہ کروا کے گئی تھی۔

نصوح۔ خوب ہوا کہ تم نے اُن کمروں کو نہ دیکھا۔

فہمیدہ۔ کیوں؟

نصوح۔ اب میں اُن کمروں کی تمامتر تفضیح تم سے بیان کروں بس مولانائے روم قدس اللہ سرہٗ[3] العزیز کا شعر

---

[1] آدمیوں کا شیطان [2] آرام [3] خدا اُن کے بھید کو پاک کرے۔ یعنی خدا کی بارگاہ میں جو راز و نیاز ان کو حاصل ہے، خدا اُس میں اور صفائی اور زیادتی کرے ۱۲

از بروں چوں گور کافر پر حلل
اندروں قہر خدائے عز و جل

گویا انھیں کمروں کی شان میں ہے۔ ظاہر آباد باطن برباد۔

فہمیدہ۔ کوئی کہتا تھا کہ تم نے غصّے میں آکر دیوان خانہ میں آگ لگا دی۔

نصوح۔ اگرچہ وہ مکان جس میں دوزخیوں کے سے کام ہوتے ہیں اسی قابل ہے، مگر میں نے مکان میں تو آگ نہیں لگائی۔

فہمیدہ۔ کچھ دھواں سا تو مردانہ میں ضرور اُٹھ رہا تھا۔

نصوح۔ وہ تو چند کتابیں تھیں جن کو میں نے بیہودہ سمجھ کر جلا دیا۔

فہمیدہ۔ ایسے غصّے سے بھی خدا پناہ میں رکھے۔

نصوح۔ غصّے کی تو اُس میں کوئی بات نہ تھی۔

فہمیدہ۔ کتاب کا جلانا غصّے کی بات نہیں تو کیا عقل کی بات ہے۔ میں نے تو سُنا ہے کہ کاغذ کو جلانا بڑا گناہ ہے نہ کہ کتاب، لوگ کہیں ذرا سا پرزہ پڑا پاتے ہیں تو اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ کتاب کو بھولے سے ٹھوکر لگ جاتی ہے تو، توبہ توبہ کر کے چومتے اور ماتھے چڑھاتے ہیں۔

نصوح۔ تم سچ کہتی ہو مگر یہ لوگوں کی زیادتی ہے۔ کاغذ بھی کپڑے کی طرح ایک بے جان چیز ہے کتاب کے عمدہ مضامین جن میں دینداری

---

[1] کافر کی گور کی طرح اوپر سے خوب آراستہ اندر خدائے بزرگ کا قہر۔

اور خدا پرستی اور نیکو کاری کا بیان ہوتا ہے وہ البتہ قابل ادب ہیں۔

فہمیدہ - خیر کچھ ہی سہی مگر کتاب ہے تو ادب کی چیز؟ پھر تم نے جلائی کیوں۔

نصوح - جن کتابوں کو میں نے جلایا اُن کے مضامین شرک اور کفر اور بیدینی اور بیحیائی اور فحش اور بدگوئی اور جھوٹ سے بھرے ہوئے تھے

فہمیدہ - کتابوں میں ایسی بُری بُری باتیں بھی ہوتی ہیں؟

نصوح - کتابیں بھی آدمی بناتے ہیں اور آدمی ایسا مخلوق سرکش ہے کہ اُس نے تمام دنیا میں بدی اور خدا کی نافرمانی پھیلا رکھی ہے، کیا تم شعر اور شاعری کے نام سے واقف نہیں ہو؟

فہمیدہ - واقف کیوں نہیں۔ کتابوں میں اکثر شعر ہوتے ہیں مگر اُن میں تو کوئی بُری بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ سنتی ہوں کہ کلیم کو شعر بنانے کا بڑا شوق ہے اور مردوں میں یہ بڑی تعریف کی بات گنی جاتی ہے؟

نصوح - شاعری اپنی ذات سے بُری نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ زباندانی کی عمدہ لیاقت کا نام شاعری ہے۔ ضرور تعریف کی بات ہے لیکن لوگوں نے ایک عام دستور قرار دے رکھا ہے کہ اس لیاقت کو ہمیشہ بُرے اور بیہودہ خیالات میں صرف کرتے ہیں۔ اس وجہ سے دینداروں کی نظر میں شاعری عیب و گناہ ہے اب شاعری اسی کا نام ہے کہ کسی کی ہجو[1] کیجئے کہ وہ داخل غیبت ہے یا مدح بیجا لکھئے کہ وہ کذب[2] و بطالت ہے

[1] کسی کی بُرائی کرنا [2] جھوٹ اور غلط ۱۲

یا عشق و عیاشی کے ناپاک خیالات میں کوئی مضمون سوچئے کہ وہ خلافِ شریعت ہے یا مسائل دین اور اہلِ دین کے ساتھ تمسخر[1] واستہزا کیجیے کہ وہ کفر و معصیت ہے۔

فہمیدہ - یہ مجھ کو آج معلوم ہوا کہ پڑھنے لکھنے کی چیزوں میں بھی لوگوں نے خرابیاں پیدا کی ہیں۔

نصوح - کیا تم کو اپنا گلستاں پڑھنا یاد نہیں؟

فہمیدہ - یاد کیوں نہیں، جس دن حمیدہ کا دودھ چھڑایا ہے اُس کے اگلے دن میں نے گلستاں شروع کی تھی۔

نصوح - بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمھارے سبق سے آگے آگے جا بجا سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیا کرتا تھا بلکہ بعض دفعہ صفحے کے صفحے ایسے آپڑے ہیں کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگا کر ان کو چھپانے کی ضرورت ہوئی؟

فہمیدہ - خوب اچھی طرح یاد ہے۔ چوتھائی کتاب سے کم تو نہ کٹی ہوگی۔

نصوح - تم پڑھتی تھیں تب چوتھائی بھی کٹی۔ اگر کوئی دوسری عورت یا لڑکی پڑھتی ہوتی تو میں آدھی کی خبر لیتا۔ وہ تمام بیہودہ باتیں تھیں جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا۔

فہمیدہ - سچ کہو، تو میں سمجھی مشکل جان کر چھڑوا دیتے ہیں۔

---

[1] مسخرا پن اور ٹھٹھا۔

نصوح۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ میں اُن واہی اور فحش باتوں کو تمھارے روبرو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ اُس کتاب کا حال ہے جو پند و اخلاق میں ہے اور تصنیف بھی ایسے بزرگ کی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کمتر نکلے گا کہ اُن کا نام لے اور شروع میں حضرت اور آخر میں رحمۃ اللہ علیہ[1] یا قدس اللہ سرہٗ العزیز نہ کہے۔ یعنی اُن کا اعتداد[2] اولیاء اللہ میں ہے اور جو کتابیں میں نے جلائیں۔ کتابیں کاہے کو تھیں گالی۔ پھکڑ ہزلیات[3]۔ بڑ۔ بکواس۔ ہذیان۔ خرافات میں نہیں جانتا ان میں سے کون سا نام اُن کے لئے زیادہ زیبا ہے۔

فہمیدہ۔ مگر جلانا کیا ضرور تھا پڑی رہنے دی ہوتیں۔ یا بک بکا جاتیں۔ آخر داموں کی چیز تھی؟

نصوح۔ شاید اگلی گرمیوں کا ذکر ہے کہ بدرو میں سانپ نکلا تھا اور اُس کو دیکھ کر چھوٹے بڑے سب ایسے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ صحن کا نکلنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور کیسا کچھ تقاضا تھا کہ جس طرح ہو سکے سانپ کو پکڑوا کر مار ڈالنا چاہیئے۔ سانپ کی نسبت تم نے ہرگز نہیں کہا کہ پڑا بھی رہنے دو، شاید کوئی سنپیرا دو چار ٹکے پیسے دے کر مول لے جائے گا؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ کتابیں اس سانپ سے زیادہ موذی[4] اور اُس سے زیادہ کہیں خطرناک تھیں اور اُن کی قیمت

---

[1] اُن پر رحمت خدا کی [2] شمار [3] بیہودہ گفتگو۔ مذاق کی باتیں [4] تکلیف پہنچانے والا۔

چوری اور ٹھگی کے مال سے بڑھ کر حرام ۔ کلیم کو اور پھٹکار کیا ہے ۔ اسی سانپ کا زہر اُس کو چڑھا ہوا ہے اور شیطان نے یہی منتر اُس پر پڑھ کر پھونک دیا ہے ۔

فہمیدہ ۔ پھر آخر اُس زہر کا تریاق[1] اور اس منتر کا توڑ بھی کچھ ہے یا نہیں؟

نصوح ۔ کیوں نہیں؟ دین و اخلاق کی کتابیں ۔ مگر کوئی اُن کو دیکھنے والا بھی ہو نہ یہ کہ ہر روز نئے سانپ سے کٹوائے جاؤ اور تریاق سے بھاگو ۔ اور نفرت رکھو ۔ تو انجام کیا ہوگا؟ ہلاکت ۔

---

[1] وہ دوا جو زہر کے اثر کو دور کرنے کے لئے دی جائے ۔

۱۵

فصل دہم

کلیم کا پہلے اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ اور پھر اپنے ایک قرابت دار فطرت کے یہاں جا کر رہنا اور دونوں مرتبہ زک اُٹھانا اور قید ہونا اور آخرکار باپ ہی کی سفارش سے رہائی پانا

اب ہم کو کلیم اور نعیمہ دونوں بھائی بہنوں کا حال بیان کرنا چاہیئے کہ باپ کے گھر سے نکل کر اُن پر کیا بیتی؟ سو چونکہ کلیم پہلے نکلا۔ پہلے اُسی کا حال بیان کرتے ہیں۔ کئی بار اُس کو باپ نے بلوایا۔ یہاں تک کہ ہار کر رقعہ لکھا۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا۔ بھائی نے بہت کچھ کہا سُنا لیکن وہی رو براہ نہ ہوا اور جب دیکھا کہ فہمیدہ صالحہ کے اتروانے میں مصروف ہے، آنکھ بچا، بے پوچھے بے کہے گھر سے اس طرح نکل کھڑا ہوا کہ گویا اُس کو کچھ تعلق ہی نہ تھا۔ شاید، اُس کے ذہن میں بھی یہ بات اُس وقت نہ گزری ہوگی کہ وہ عمر بھر کے واسطے گھر سے جا رہا ہے اور عزیز واقارب

جن سے وہ ایسے سرسری طور پر جدا ہوتا ہے جیسے جی اُن کو نہ دیکھ سکے گا۔ یہ نکلنا کچھ اُس کا نیا نکلنا نہ تھا بلکہ معمولی عادت اور ہمیشہ کی خصلت تھی۔ گھر سے نکل جانے کی اُس نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی تھی کہ ذرا ذرا سی ادعائی[1] ناخوشی پر وہ آئے دن بھاگا کرتا تھا۔ مگر ادھر اس کا نکلنا معلوم ہوا اور اُدھر نوکروں کے جاسوس اُس کی جستجو میں دوڑنے شروع ہوئے۔ شروع شروع میں تو نوکروں ہی کے بُلانے سے چلا آتا تھا۔ پھر چندے یہ معمول رہا کہ اب خود میاں نصوح جاتے تو صاحبزادہ بلند اقبال کو منا لاتے اب تھوڑے دنوں سے نصوح کے عمل میں بھی تاثیر گھٹ گئی تھی تو بی فہمیدہ کی ڈولی دربدر ماری پھرا کرتی تھی اس دفعہ بھی وہ ضرور یہ توقع جی میں لیکر نکلا کہ گلی سے نکلتے نکلتے نوکر اُس کے پیچھے دوڑیں گے۔ اور اس امید میں اُس نے اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر پہنچتے پہنچتے کوئی سیکڑوں ہی مرتبہ پیچھے پھر پھر کر دیکھا مگر واقع میں یہ اُس کی غلط فہمی تھی۔ اب کلیم کے سوائے بقول نعیمہ گھر کا باوا آدم[2] بدلا ہوا تھا۔ نہ پہلی سی ماں، نہ اگلا سا باپ۔ نوکر ڈھونڈیں کیوں؟ اور دوڑیں کس لئے؟ پھر بھی کلیم اس سے بیخبر نہ تھا کہ اس مرتبہ ایک خاص طرح کا بگاڑ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ دینداری کا نیا چرچہ گھر میں ہو رہا ہے۔ خلاف توقع نعیمہ ایک تھپڑ کھا چکی ہے۔ سلیم اور حمیدہ جو گھر میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے کلیم اور نعیمہ کے تختۂ مشق تھے اب سب سے زیادہ باپ اور ماں دونوں کے

[1] زبردستی کی دل سے بنائی ہوئی [2] طور طریق۔

چھپتے ہو رہے ہیں۔ یعنی جن کی بڑی لمبی چوڑی عزت تھی وہ ذلیل ہیں اور جو بے وقعت تھے اُن کا طوطی بول رہا ہے۔

پہلے جب کبھی کلیم گھر سے ناخوش ہو کر نکلا تو کھانے کپڑے روپے پیسے کے لین دین پر۔ ماں یا بھائی بہنوں سے لڑائی جھگڑے کے سبب لیکن اس دفعہ دین کی بحث تھی، نہ لین دین کی۔ باپ سے لڑائی تھی نہ بھائی بہنوں سے۔ ذراسی عقل معاملہ فہم بھی کلیم کو ہوتی تو وہ ایسی حالت میں گھر سے نکلنے پر دلیری نہ کرتا۔ لیکن جیسا کہ نصوح نے تجویز کیا تھا اُس پر شاعری کی پھٹکار تھی اور سر پر شامتِ اعمال سوار۔ اور واقع میں جب انسان شبانہ[1] روز داد تحسین[2] کی فکر میں منہمک رہے گا تو ضرور ہے کہ خود پسندی، خود بینی۔ خود ستائی، کے عیوب اُس کی طبیعت میں راسخ ہوں۔ شعر و سخن کے اعتبار سے ہم بھی کلیم کو شاباش دیتے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معاملہ[3] اچھا باندھتا ہے تضمین[4] میں گرہ خوب لگاتا ہے بندش بھی خاصی ہوتی ہے۔ قصیدہ بھی بُرا نہیں کہتا طبیعت مضمون آفرینی پر بھی مائل ہے۔ مثنوی تو خیر مگر رُباعی اُس کی لاجواب ہوتی ہے۔ مقطع میں تخلص کا نباہ یا تو متاخرین[5] میں مومن مرحوم میں دیکھا یا اب ماشاءاللہ میاں کلیم میں۔ صنائع[6] لفظی کے اتنے التزام پر بے ساختگی[7] اور قابل آفرین ہے

---

[1] رات دن [2] تعریف [3] راز و نیازِ عشق [4] مثلث۔ مخمس یا مسدس وغیرہ نظم [5] آخر وقت کے شاعروں [6] خوبیاں [7] برجستگی

اب قصیدے کی تشبیب[1] بعد چندے سودا کے لگ[2] بھگ ہونے والی ہے۔
چشم بد دُور۔ چھ سات برس کی مشق میں دو دیوانوں کا مرتّب ہوجانا کچھ
تھوڑی بات نہیں۔ شہر میں بھلا کچھ نہیں تو سَو[۴] دو سَو غزلیں لوگوں کے
زبان[3] زد ہوں گی، سچ ہے "قبول سخن خدا داد بات ہے"۔
الغرض شاعری میں کلیم کی لن ترانیاں[4] چنداں بیجا نہ تھیں۔ لیکن
دُنیا کے معاملات میں از بسکہ غور و خوض کرنے کی عادت نہ تھی۔ اسی وجہ
سے اُس کی رائے[5] بر سر غلط ہوتی تھی۔ وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلّف
مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف کو مُڑا جیسے مطلق العنان[6] گھوڑا تھان کی طرف
رُخ کرتا ہے۔ مرزا کی ظاہر داری نے اُس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا۔
کہ وہ اُن کو ماں باپ بھائی بہن۔ خویش و اقارب سب سے بڑھ کر اپنا
خیر خواہ۔ سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا اور بے امتحان، بے آزمائش
اُس کو مرزا پر ایسا تکیہ[7] و اعتماد تھا کہ اتنا شاید دانشمند آدمی کو متواتر تجربوں
کے بعد بھی کسی دوست پر نہیں ہو سکتا۔ بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی[8]
کی جو ایک صفت ہے کلیم میں مطلق نہ تھی۔ مرزا سے زیادہ اس کو اپنی نسبت
مغالطہ[9] تھا اور اُس نے اپنے تئیں ایسا عزیز الوجود فرض کر رکھا تھا کہ ایک
سے ایک لائق نوکری کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی اور

[1] وہ شعر جو قصیدہ کے شروع میں کسی خاص مضمون کے لئے کہے جاتے ہیں [2] قریب
قریب [3] مروّج [4] شیخیاں [5] سرے سے۔ شروع سے۔ قطعی [6] بے لگام۔ آزاد رو
[7] بھروسہ [8] علم قیافہ [9] غلطی۔ دھوکا

کلیم کے ذہن میں از خود یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اُس کے قدوم میمنت[1] لزوم کی متمنّی اور منتظر ہیں۔ اور جس طرف کو چل کھڑا ہوگا وہاں کا والیِ ملک اُس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ گھر سے نکلا تو محض تہیدست[2] لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے مالک خزائن الارض[3] بننے والا ہوں۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا۔ مگر اس تصوّر میں مست کہ فیل کوہ پیکر[4] مع ہودجِ زر[5] اُس کی سواری کے لئے آرہا ہے باوجودیکہ شبخوابی کے کپڑوں کے سوائے بدن پر کچھ نہ تھا۔ تاہم خلعتِ ہفت پارچہ کی اُمیّد میں ؎

نظر اُس کی نخوت کے زینہ پہ تھی
کہ شانوں سے اُتری تو سینہ پہ تھی

قصّہ کوتاہ کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سوچکے تھے۔ کلیم نے دروازہ پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں۔ ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو ایسی عالیجاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی اُس پر خود اُس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک

[1] متبرک آمد [2] مفلس [3] زمین کے خزانے [4] بہت جسیم ہاتھی [5] سونے کا ہودہ۔

کہ اُس کا اعتداد دلّی کے روداروں[1] میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائلِ عمر[2] میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دُور کی قرابت تھی حِسبۃً للہ اس کا تکفّل اپنے ذمّہ لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اُس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی لیکن جمعدار کے مرنے پر اُس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے۔ انھوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے مگر اُن کے ورثا نے بہزار دقّت محلسرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ اُن کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینہ کے کرایہ کی دُکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی۔ تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات، اُس پر مرزا کی شیخی اور خود یہ مسخرا اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ ماہواری کی مستقل آمدنی تھی۔

اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھُستا تھا یہ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادّعائی رشتہ ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اُس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نبھے تو کیسے نبھے۔ دُکانیں گردی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں

[1] عزّت داروں [2] شروع عمر

بیچاری بہتیرا بکتی مگر کون سُنتا تھا۔ مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی۔ سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب نیچے کوئی طرحدار سا ڈھاکے کا ینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سُرخ نیفہ۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اُس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی مجلسرا کو مرزا کی مجلسرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے

نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں۔ اور اُن میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں؟ اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے۔ اور کون مرزا!

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ کلیم نے کہا کہ "کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محلسرا نہیں ہے؟"

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں؟

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے؟

دوسری لونڈی۔ اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا۔ جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ ڈبلا ڈیل اپنے تئیں بہت

بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔
کلیم۔ ہاں ہاں۔ وہی ظاہر دار بیگ۔
لونڈی۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اس میں رہتے ہیں۔
کلیم نے وہاں جا آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دُھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے "آہا۔ آپ ہیں۔ معاف کیجیے گا، میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں"۔
کلیم۔ چلیے گا کہاں؟ میں آپ کے پاس تک آیا تھا۔
مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں۔
کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے کی نیّت سے آیا ہوں۔
مرزا۔ بسم اللہ، تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔
کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد ضرار[1] کی طرح ویران۔ وحشت ناک نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا۔ نہ طالب علم نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اُس میں رہتی ہیں، کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر

[1] وہ مسجد جو ضدیوں نے دوسری مسجدوں کو اُجاڑنے کے لئے بنوائی اور پیغمبر نے ڈھوا دی تھی۔

اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اُسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع[1] دخل مقدر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو اُن کو غشی میں پایا اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار۔ بھائی کی التجا۔ ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سُنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو؟

مرزا۔ خیر "نیت شب[2] حرام" صبح تو ہو۔ آپ بے تکلّف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محلسرائیں متعدد دیوان خانہ کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دُکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی

[1] شکایت سننے سے پہلے عُذر [2] رات کا ارادہ غیر مستقل

قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جس کو تم نے اپنی بلک نہ بتایا ہو، یا یہ
حال ہے کہ ایک تنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔
جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا
کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اُس تمام
جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب
کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے
آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو
آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم مغفور
نے متبنٰی کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے
واقف اور آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں
کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے، صحبتِ
ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا
حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے اندر باہر دادیلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات
کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندہ کو منالے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا؟

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے
بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں

لہ لے پالک۔ گود لیا بیٹا۔

تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر۔ مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیجدیجئے، تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جئے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے، تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ دوں گا مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑکر نکلا ہے، تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو

بیچارے نے بے غیرت بنکر خود کہا کہ سنو یار۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو؟

کلیم۔ تمھارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے؟ دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی مگر ظاہر ا تم سے بھوک کی سہار[1] ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے دیو اشتہا[2] کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہوگی۔ رات کا وقت ہے۔ ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن[3] میں چنے بھنوا لائے مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے۔ یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔

---

[1] برداشت [2] بھوک کا دیو [3] ذرا سی دیر۔

کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے اتنی تورات گئی ہے مگر چھدامی کی دُکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندہ نے تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دُکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور؟ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں تو صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف[۱] کی حکایت سُنی ہے؟

کلیم۔ فرمائیے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل[۲] کی خدمت میں جن کو ارزاق[۳] عباد[۴] کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جہاں میں نے سر زمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات[۵] اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ میری قطع و برید[۶] ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بالا ور ہوا تو خدا

---

۱ خوش مزاج ۲ فرشتۂ قسام رزق ۳ جمع رزق کی ۴ جمع عبد کی ۵ اشیاء خوردنی ۶ کاٹ چھانٹ۔

جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من پونٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہُولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھُس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اُس کو چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑیں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں۔ گھنگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیلؑ کے دربار میں اس طرح پر بیباکانہ چپڑ چپڑ بولنا سُن کر حاضرین دربار اس قدر خوش ہوئے کہ ہر شخص اُسے کھانے کو دوڑا۔" چنا یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔"

سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آز[1] بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا ورنہ میر بدّو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں؟ غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست، کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی اُس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزہ دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا وہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیّر ہونا عبرت کا مقام ہے یا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آگر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوانِ نعمت[2] کو

---

[1] حرص کے دانت [2] طرح طرح کی نعمتیں۔

لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمتگار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نوگرفتار، اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا اپنی حرکت بے سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اُسی وقت نہیں تو سویرے گجر دَم[1] باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں کہی۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیّار ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ۔ دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اُس کے جسم سے جُدا تھی لیکر چمپت ہوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کے اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگدڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہوکر میں کہیں بُھتنا تو نہیں ہو گیا، مرزا کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اُس میں پانی کہاں، صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آنکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منھ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جو ہیں زینے پر

[1] علی الصباح گجر کے وقت۔

چڑھا کر کلیم اُس سے عرض کرنے کے لئے لپکا وہ لڑکا اُس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اُس نے اُس کو بھوت سمجھا یا بڑی خیال کیا کلیم نے بہتیرا پکارا اُس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔

کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرکے ممکن ہو تو مُنھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پُرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا کیوں حضرت آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی۔ ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ اور دری کا نام سُن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی، مرزا زبردست بیگ! دیکھنا یہ مُردوا کہیں چل نہ دے دوڑ کر تکیہ دری تو اُس سے لو۔

کلیم یہ بات سُن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ

زبردست نے چور چور کر کے جالیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست[1] کا ٹھینگا سر پر اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سُنا۔ اور کلیم سے اُس کا حسب و نسب پوچھا۔ ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھینپتا تھا مگر چار و ناچار اُس کو بتانا پڑا۔ لیکن اُس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سُن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو میں اُن کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ اُن کے بڑے بیٹے کا بھی یہی نام ہے جو تم نے اپنا بیان کیا۔ محلّے کا پتہ گھر کا نشان بھی جو تم نے کہا سب ٹھیک مگر کلیم تو ایک مشہور معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اُس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمھاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی مجھ کو باور نہیں ہوتا اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے جرم سنگین ہے ان کو حوالات میں رکھو۔ صبح ہو، میں ان کے والد کو بلواؤں تو اُن کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سُن کر رُو دیا اور کہا کہ میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سُنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو تو میں اپنے انکار تازہ آپ کو سُناؤں۔ چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد و مرزا کی شان میں کہا تھا سُنایا۔ اُس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے

[1] یعنی زبردست سے بس نہیں چلتا اس کی ماننا پڑتی ہے۔

اور اُن کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ ان کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا ورنہ واپس لا کر حوالات میں قید رکھنا۔ کلیم پر اس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا جیسا کچھ شاق گزرا ہوگا۔ ظاہر ہے مگر کیا کر سکتا تھا سپاہی اُس کو کشاں کشاں لے ہی گئے۔ محلّے کی مسجد جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا اُس کے گھر سے بہت قریب تھی۔ صحن مسجد میں ایک شاداب چمن تھا اور چمن کے بیچوں بیچ ایک پکّا مُرتفع چبوترہ عجب تفریح کا مقام تھا۔ نصوح بیشتر نماز عشا کے بعد خصوصاً چاندنی راتوں میں اُس چبوترے پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خداوند تعالیٰ کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اُس کو بیٹھا دیکھ دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور نصوح کو وعظ و پند کے طور پر اُن سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔ نصوح اور اُس کے مستمعین مسجد کے چبوترے پر جمع ہوتے جاتے تھے کہ کوتوالی کے سپاہی کلیم کو لئے آپہنچے۔

یہ اتفاق منجانب اللہ شاید اس وجہ سے پیش آیا کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اس وجہ سے ذلیل تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے یا اپنے اور بال بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے محنت مزدوری کر کے بوجہ حلال روزی پیدا کرتے تھے اُن کے سامنے اُس کی گردن نخوت نیچی ہو۔ اب وہ اُنھیں قلاُ ذریوں اور مردہ شویوں اور بھک منگوں اور ٹگر گدایوں کے روبرو اس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی طرح دو سپاہی اُس کی گردن پر سوار تھے نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی دو وقت کے

فاقے سے مُنہ سوکھ کر ذری سا نکل آیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔
ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ حال تھا کہ ایسے لباس
سے ننگا ہوتا تو بہتر تھا۔

جوہیں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی گویا ایک تیر سا کلیجے میں لگ گیا
اگر پہلا سا نصوح ہوتا تو نہیں معلوم عورتوں کی طرح ڈاڑھیں مار کر رونا
سر پیٹنے لگتا یا دوڑ کر بیٹے کو لپٹ جاتا یا سپاہیوں سے بے پوچھے گچھے
دست و گریبان ہو پڑتا یا خدا جانے اضطراب جاہلانہ میں کیا کرتا مگر
اب اس کی جملہ حرکات و سکنات مُعلم دینداری کی مطیع اور مؤدب خداپرستی
کی تابع تھیں۔ اُس نے ایک دمِ سرد بھر کر "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"
تو کہا اور اُف بھی نہ کی۔ سپاہیوں نے اُس سے کلیم کی نسبت پوچھا تو
اُس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا کہ "جب حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے
دَم تک بیٹا بیٹا پکارتے رہے تو میں اس کے فرزند ہونے سے کیونکر انکار
کر سکتا ہوں۔ سپاہی تو اتنا سُن کر رخصت ہوئے اور کلیم کو رفقائے نصوح
میں سے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا کیوں کلیم؟ میں نے ایسا
کون سا قصور کیا تھا کہ تم کو میری طلعتِ[1] منحوس تک دیکھنی گوارا نہ ہوئی۔
تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ شفقتِ اولاد۔ ماں باپ کی طینت[2]
میں مُخمّر[3] اور اُن کی جبلت[4] میں داخل ہے۔ وہ شفقت جو اس وقت مجھ کو

---

[1] بدشکل صورت [2] طبیعت [3] خمیر کی گئی [4] پیدائشی عادت۔ فطرت

اس بات کی محرک[1] ہوئی کہ میں سپاہیوں کے پنجے سے تمھاری نجات کا باعث ہوا دہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی تھی اور کرتی ہے اور کرے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں جو تمھاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو، میں نے تم سے نہیں کہا کہ میرے لئے کمائی کرو۔ میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اُٹھاؤ اور اگر میں ایسا کہتا بھی تو مجھ کو اُس کا منصب اور حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا وہ تمھارے ہی کام آوے گی۔ اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمھیں کو آرام دے گی، اگر کسی بیمار کا، طبیب مہربان سے، پرہیز کرنا کسی سیاح[2] کا بدرقہ[3] خیرخواہ سے گریز کرنا۔ روا ہے۔ تو بیشک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم؟ کیا ہمیشہ تمھاری خوشی مجھ کو منظور۔ تمھاری رضاجوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی؟ اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اپنا عدو ٹھہرایا، تو دشمنی کا سبب؟ عداوت کا موجب؟ میں نے سُنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنوں اور مختل الحواس[4] تجویز کرتے ہو۔ سو میں تمھاری اس تشخیص صحیح اور تجویز درست اور اس فراست[5] صائب پر جرح نہیں کرتا۔ میں باؤلا اور بھٹری اور پاگل سہی لیکن اگر کوئی باؤلا تمھاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے تو کیا اُس کی بات کو نہ سُننا اُس کی نصیحت کو نہ ماننا اُس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا شیوۂ دانشمندی ہے۔ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا۔ اور چاہیئے کہ آیا میں اکیلا

[1] تحریک کرنے والی [2] سیر کرنیوالا [3] رہنما۔ ساتھی [4] حواس پراگندہ [5] پختہ اور صحیح سمجھ

اِس جنون میں مبتلا ہوں یا اور بندگان خدا بھی میری ہی سی رائے ۔ میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں ۔ کلیم ! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جتنے بزرگانِ دین ہو گزرے ہیں (خدا اُن کی پاکیزہ اور مطہر[1] روحوں پر رحمت کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا ان کی حیات میں برکت دے) کوئی اس جنون سے خالی نہیں ۔ بلکہ جس کو جتنا یہ جنون زیادہ اُسی قدر وہ برگزیدہ اور خدا رسیدہ ۔ زیادہ کیا ؟ اس بات کا اقرار کرنا جنون ہے کہ ہم بندے ہیں اور اُس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے جس نے ہم کو پیدا کیا جو ہم کو روزی دیتا ہے ، جو ہم کو جلاتا ہے اور مارتا ہے ۔ جو پانی برساتا اور زمین سے ہمارے لئے سرمایۂ حیات اُگاتا ہے جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لئے آب شیریں و خوشگوار کے سوتے زمین میں جاری کر رکھے ہیں اور ہماری روحوں کے انبساط[2] کے لئے ہوا کا ذخیرہ کافی مہیا فرما دیا ہے ۔ جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں تاکہ کام کرنے کے لئے دن ہو اور آرام لینے کے لئے رات ۔ جس نے دنیا کی قوی ہیکل[3] اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع و منقاد[4] بنا دیا ہے کہ اُن سے ہم سواری لیتے اور اُن پر اپنا بوجھ لادتے ، اُن کے گوشت اور پوست اور دودھ سے مستفید[5] ہوتے ہیں ۔ جس نے انسان کو گویائی و بیان کی

---

[1] پاک [2] شگفتگی ۔ خوشی [3] بڑے ڈیل ڈول والے [4] فرمانبردار [5] فائدہ اٹھانے والے ۔

قوت عطا کی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنا مافی الضمیر[1] اپنے ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے۔ جس نے انسان ضعیف البنیان کو عقل کی قوت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے۔ جس نے کائنات میں سے ہر موجود کو اُس کی مناسب حالت پر خلق کیا ہے۔" اگر دُنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کردیے جائیں اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ کام میں لایا جائے اور پڑھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے ہیں، سب کے سب مل کر اس کی تعریف اُس کے احسانات اُس کے انعامات روز قیامت تک بیٹھے لکھا کریں تو گھِستے گھِستے درخت ہو چکیں سمندر سوکھ جائیں لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں مگر اس کے حق واجب کا ایک عشر عشیر[2] بھی ادا نہ ہو۔

کلیم، فنا ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ دنیا میں کوئی اُس کا منکر نہیں اور نہ اُس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضے کی وبا کو دفع ہوئے برس نہیں گزرے۔ تمھارے دیکھتے کیسے کیسے لوگ، ہٹے کٹے توانا، اچھے بھلے، چلتے پھرتے، امیر غریب، عالم و جاہل، بھلے اور بُرے سب ہی طرح کے صدہا، ہزارہا، ہدفِ تیر قضا ہو گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ وبا پر کیا منحصر ہے، وعدے سے دم زیادہ نہ کم۔ مرنا برحق، اچھا پھر مرے پیچھے کیا ہوگا؟ وہی عقیل ہے، وہی فہیم، وہی زیرک[3] وہی دانشمند

[1] دل کی بات [2] ۱/۱۰۰ [3] ہوشیار

جو اس سوال کا جواب معقول دے جو اس معمّے کو حل کرے۔ جو یہ پہیلی بوجھے۔ کلیم، انسان کی خاص طرح کی خلقت یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ ضرور اس سے کوئی بڑی خدمت متعلق اور اُس کے ذمہ زیادہ جوابدہی ہے۔ اگر اس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سو رہے اور گرمی اور سردی سے اپنے تئیں بچائے تو اس کیلئے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی۔ جانور اپنے بڑے سے بڑے جثوں[1] کی پرداخت[2] پر بخوبی قادر ہیں۔ حالانکہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں۔ پس اُس خدمت اور اُس ذمہ داری کو دریافت کرنا شرط انسانیت ہے۔

نصوح کا وعظ سُن کر اُس کے ہمراہیوں کے دلوں میں دینداری کے ولولے اور خدا پرستی کے جوش تازہ ہو گئے۔ حاضرین میں کلیم کے سوائے کوئی تنفس نہ تھا۔ جس پر تھوڑی یا بہت رقت طاری نہ ہوئی ہو۔ لیکن کلیم بقول سعدی شیرازی ؎

باسیہ[3] دل چہ سود گفتن وعظ
نرود میخ آہنی در سنگ

سکوت کی حالت میں سرنگوں تھا۔ اس کا سکوت یا تو اس وجہ سے تھا کہ نصوح کا سلسلۂ سخن بلا فصل تھا اور اُس کو بیچ میں بات کہنے کا موقع

[1] جسموں [2] پرورش [3] جس کا دل سیاہ ہے اُسے نصیحت کرنا کیا فائدہ کرے گا کیونکہ پتھر میں لوہے کی کیل نہیں گڑتی۔

نہیں ملتا تھا۔ یا دوسرے منصوبے سوچ رہا تھا۔ اُس کا سرنگوں ہونا بھی کچھ گناہ کی ندامت سے نہ تھا بلکہ اپنی حالت کی شرمندگی سے۔ جب نصوح نے دیکھا کہ وہ ہاں یا نہیں کچھ بھی نہیں کہتا تو اُس نے ذرا گرم ہو کر اتنی بات کہی کہ بڑی دقّت تمھارے معاملہ میں مجھ کو یہ درپیش ہے کہ تمھارا مافی الضمیر مجھ پر منکشف[1] نہیں ہوتا۔ شروع میں تم نے میرے سامنے آنے سے گریز کیا اور اب مواجہہ بھی ہوا تو بیسود ابھی تک کلیم نے کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا کہ نصوح کے ہمراہی جو کلیم کے حالات سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ دینداری کی تاکید پر گھر سے نکل گیا ہے۔ بول اٹھے کہ " اے حضرت! میاں کلیم ماشاء اللہ بڑے ذہین اور زیرک اور عاقل ہیں۔ جو آپ نے فرمایا اُنھوں نے گرہ باندھا۔ اگرچہ باقتضائے سن اب تک لہو و لعب کی طرف متوجہ تھے مگر اب آپ دیکھئے گا کہ انشاء اللہ ایسے جوان صالح اور متشرع[2] اور متقی[3] بنیں گے کہ اپنے ہمعمروں کے لئے نمونہ ہوں گے۔ آپ گھر میں تشریف لے جائیے۔ یہ بھی آپ کے ساتھ جائیں کپڑے بدلیں اور آپ کی نصیحت پر عمل کریں۔ جس میں دنیا اور دین دونوں کا فائدہ ہے۔"

نصوح نے پھر کلیم کی طرف مخاطب ہو کر کہا "کیوں صاحب؟ کچھ تم بھی تو اپنے دل کا ارادہ بیان کرو"

کلیم۔ مجھ کو آپ اتنی اجازت دیجئے کہ گھر سے اپنی ضرورت کی

---

[1] ظاہر [2] پابند شرع [3] پرہیزگار۔

چند چیزیں منگوا لوں۔

نصوح۔ سخت افسوس ہے کہ تم دُنیا کی چند روزہ اور عارضی ضرورتوں کا تو اہتمام کرتے ہو اور دین کی بڑی ضرورت سے غافل ہو۔

غم دینؔ خور کہ غم غم دین است
ہمہ غمہا فرو تر از این ست

ضرورت کی چیزیں منگوا لینا کیا معنی تم شوق سے گھر میں چلو۔ غالباً میری نسبت تم کو اس گھر میں زیادہ دنوں رہنا ہے۔ پس وہ گھر میرا کیوں فرض کر لیا گیا ہے۔ تمھاری ماں بہت بیتاب ہے۔ چھوٹے بڑے سب فکرمند ہیں۔ میرے جرم کی سزا دوسروں کو دنیا شیوۂ انصاف سے بعید ہے۔

کلیم۔ مجھ کو معلوم ہے کہ آپ چند روز سے دینداری اور خدا پرستی کے نام سے نئے نئے دستور، نئے نئے طریقے، نئے نئے قاعدے گھر میں جاری کرنے چاہتے ہیں اور اس جدید انتظام میں جیسا کچھ اہتمام آپ کو منظور ہے میں کیا گھر میں کوئی متنفس اُس سے بیخبر نہیں۔ ہر شخص اس بات کو اچھی طرح سے جان چکا ہے کہ اس انتظام جدید کی مخالفت کے ساتھ گھر میں رہ نہیں سکتا۔ میں نے اپنی طرف سے بہتیری کوشش کی کہ مجھ کو اپنی مخالفت آپ کے رُو در رُو ظاہر کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ مگر آپ کے اصرار نے مجھ کو مجبور کر دیا اور اب ناچار مجھ کو کہنا پڑا کہ میں شروع سے اس انتظام کا مخالف ہوں اور میرا اگر چہ میری رائے کے ظاہر

لہ دین کا غم کر کیوں کہ غم اصل میں دین ہی کا ہے اور سارے غم اس سے کم ہیں۔

کر دینے کے لئے کافی تھا۔ میں ایک بال کے برابر اپنی طرزِ زندگی کو نہیں بدل سکتا۔ اور اگر جزا اور سخت گیری کے خوف سے میں اپنی رائے کی آزادی باقی نہ رکھ سکوں تو تُف ہے میری ہمّت پر اور نفرین ہے میری غیرت پر۔ اور میں اس میں بھی کلام نہیں کرتا آپ کو اپنے گھر میں ہر طرح کے انتظام کا اختیار حاصل ہے مگر اُس جبری انتظام کے وہی لوگ پابند ہو سکتے ہیں جن کو اُس کی واجبیت تسلیم ہو یا جو اُس کی مخالفت پر قدرت نہ رکھتے ہوں اور چونکہ میں دونوں شقوں سے خارج ہوں میں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ گھر سے الگ ہو جاؤں اور اگرچہ میری اُس وقت کی حالت پر یہ کہنا زیب نہیں دیتا لیکن ذرا مجھ کو دہلی سے نکلنے دیجئے تو پھر آپ اور سب لوگ دیکھ لیں گے کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ وطن میں آدمی بے قدر ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کے نزدیک بھی یہ بات ثابت ہے کہ مجھ کو گھر سے نکلنے پر بھیک مانگے نہیں ملے گی۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہی آپ کا فرزند نالائق ناخلف ہو گا۔ اور کسی امیر کی مصاحبت ہو گی یا کسی ریاست کی مسندِ وزارت میں ایسا بھی احمق نہیں ہوں کہ آپ پر نامہربانی کی تہمت لگاؤں۔ آپ وہی بات فرماتے ہیں جو آپ میرے حق میں بہتر سمجھتے ہیں لیکن میری بے ادبی اور گستاخی معاف۔ میں اپنے تئیں محتاج تعلیم و ہدایت نہیں سمجھتا۔ رہا گھر سو اُس میں میں صرف اس شرط سے چل سکتا ہوں کہ آپ میرے نیک و بد سے بحث، میرے بھلے بُرے سے تعرض کرنیکا قول واثق

اور وعدہ حمتی کریں۔

نصوح۔ اس کا یہ مطلب کہ تم نے مجھ کو منصب پدری سے معزول کیا۔

کلیم۔ نہیں آپ نے مجھ کو فرزندی سے عاق فرمایا۔

اس کے بعد نصوح گھر میں آنے کی نیت سے اٹھا اور اس کا ارادہ تھا کہ طوعاً و کرہاً جس طرح ممکن ہو کلیم کو ساتھ لوا جائے۔ مگر کلیم نہیں معلوم کیونکر نصوح کے بطون کو تاڑ گیا کہ اس کو اُٹھتا دیکھ چبوترے سے جست کی تو صحن میں تھا اور صحن سے تڑپا تو احاطہ کے باہر لوگوں نے دوڑ کر دیکھا تو وہ بازار کے پرلے سرے جا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر نصوح ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا اور جس طرح اُس نے بیٹے کو سپاہیوں کے ہاتھوں میں گرفتار دیکھ کر اناللہ کہا تھا اب بیٹے سے جدا ہوتے وقت بھی وہ اناللہ کہہ کر چپ ہو رہا۔ غرض کلیم نہ گھر گیا اور نہ گھر سے کوئی چیز لینی نصیب ہوئی۔ اُسی طرح الٹے پاؤں پھر کر چلا گیا۔ نصوح کے پہنچتے پہنچتے یہ تمام ماجرا کسی نے گھر میں جا کر کہا اور مستورات میں بیٹھے بٹھائے ایک کہرام مچ گیا۔ فہمیدہ بیتاب ہو کر باولوں کی طرح دروازے میں آکھڑی ہوئی اور قریب تھا کہ پردے سے باہر نکل آئے کہ نصوح جا پہنچا۔ بی بی کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر حیران ہو کر پوچھا کہ "خیر تو ہے؟ کہاں کھڑی ہو؟" فہمیدہ میاں کو دیکھ کر بلک گئی اور گھبرا کر پوچھا کہ "میرا کلیم کہاں ہے"؟

نصوح۔ "میرا کلیم"! اگر کلیم تمھارا ہوتا تو تمھارے گھر میں ہوتا اور تمھارے اور باپ اور بھائی کے اتنے اصرار اور اتنے سمجھانے اور اتنی

منت اور اتنی خوشامد پر بے پوچھے بے کہے گھر سے نہ چلا جاتا۔

فہمیدہ ۔ اچھے، خدا کے لئے ذرا مجھ کو اُس کی صورت دکھا دو۔ میں نے سُنا ہے کہ سر سے ننگا ہے پانوں میں جوتی نہیں۔ اُس نے کاہے کو کبھی زمین پر پانوں رکھا تھا۔ کنکر تلوؤں میں چبھتے ہوں گے۔ کون سے وہ موئے سپاہی تھے۔ میرے بچّے کے پکڑنے والے۔ گھورا ہو تو الٰہی دیدے پھوٹیں۔ ہاتھ لگایا ہو تو خدا کرے پُور پُور سے کوڑھ ٹپکے۔ وارے تھے وہ سپاہی اور قربان کیا تھا وہ کوتوال۔ میرا بچّہ اور چوری کرنے قابل۔

نصوح ۔ کیسی بدعقلی کی باتیں کرتی ہو۔ چلو گھر میں چل کر بیٹھو۔ باہر گلی میں تمھاری آواز جاتی ہے۔ تمھاری اس بیتابی کی محبت نے اولاد کو دُنیا و دین دونوں سے تو کھو دیا۔ اب دیکھئے کیا کرے گی؟

فہمیدہ ۔ اچھا پھر کلیم گیا تو کہاں گیا؟

نصوح ۔ جانے میری جوتی، کہاں گیا؟ مجھ سے پوچھ کر گیا ہو تو بتاؤں۔ نہیں معلوم خدائی خوار کہاں تھا اور کیسے لوگوں میں تھا کہ جو رُسوائی ہفتاد پشت سے نہیں ہوئی تھی وہ اس مردک کی وجہ سے ہوئی۔ اب مجھ کو شہر میں منھ دکھانا مشکل ہے، یا تو خدا اُس کو نیک ہدایت دے یا میں اُس کو تو کیا بد دُعا دوں مجھ کو ایمان سے اٹھائے کہ ان تکلیفوں سے مجھ کو نجات ہو۔

فہمیدہ ۔ کیونکر تمھارے دل نے صبر کیا اور کن آنکھوں سے تم نے بیٹے کو اس حالت میں دیکھا۔

نصوح۔ جس طرح اُس کی اس گستاخی پر صبر کیا تھا کہ میں نے بار بار بُلایا اور وہ نہ آیا اُسی طرح میں نے اُس کی وہ حالت دیکھ کر صبر کیا اور جن آنکھوں سے اُس کے خلوت خانہ، عشرت منزل، اور کتب خانے کی رُسوائی اور خرابی اور تفضیح کو دیکھا تھا اُنھیں آنکھوں سے اُس کو کھلے سر، ننگے پانوں چور بنا ہوا سپاہیوں کی حراست میں دیکھا ؎

جو کچھ خُدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

فہمیدہ۔ تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ اُس کو مجھ تک لے آتے؟

نصوح۔ اگر میں اُس کو تم تک نہ لا سکا تو مجھ سے پہلے تم اُس کو مجھ تک نہیں لا سکیں اور نہ تم اُس کو جانے سے روک سکیں۔

فہمیدہ۔ کہاں تم مرد کہاں میں عورت؟

نصوح۔ تو کیا تمھاری مرضی تھی کہ میں اُس سے کشتی لڑتا۔ بس ایسے اخلاص سے مجھ کو معاف رکھئے!

غرض نصوح سمجھا بُجھا کر بی بی کو گھر میں لے گیا اور یہ بات اُس کے ذہن نشین کر دی کہ رونے اور رنج کرنے سے مطلق فائدہ نہیں، البتہ خدا سے اُس کے حق میں زار نالی کے ساتھ دُعا کرنی چاہیے کہ بامُراد اُس کو واپس لائے۔ ادھر کلیم نے خالہ کے یہاں جانے کا ارادہ کیا مگر اُس وقت تک اُس کو نعیمہ کا حال معلوم نہ تھا۔ اگر کہیں خالہ کے یہاں چلا گیا ہوتا تو سب سے بہتر بات تھی۔ سر دست اُس کی ہمدردی کرنے کو نعیمہ وہاں موجود تھی۔ اور چونکہ اس کی خالہ کا سارا خاندان نیک اور

دیندار تھا کلیم کو نصوح کے خیالات سے مانوس کرنے کے لئے وہاں ہر طرح کا موقع تھا لیکن عصیان[1] خدا کا وبال اور عقوق[2] والدین کی شامت ابھی بہت سی گردشیں اُس کی تقدیر میں تھیں۔ جوں ہی گلی کے باہر نکلا کہ میاں فطرت اُس کو مل گئے یہ حضرت نصوح کے چچا زاد بھائیوں میں تھے اور اُن سے اور نصوح سے موروثی عداوت تھی جیسی کہ دنیادار خاندانوں میں اکثر ہوا کرتی ہے۔ رشتہ داری کی وجہ سے ایک کے حالات دوسرے سے مخفی نہ تھے۔ فطرت سُن چکا تھا کہ نصوح کو دینداری کا نیا خبط اُچھلا ہے جس کی وجہ سے اُس کے تمام خاندان میں ایک کھلبلی مچ رہی ہے۔ جو دقتیں بیچارے نصوح کو اصلاح خاندان میں پیش آتی تھیں فطرت کو سب کی خبر لگتی تھی اور یہاں کے تذکروں کا ایک مضحکہ ہوتا تھا۔ کلیم کی عادت سے تو واقف تھا ہی۔ فطرت اپنے یہاں خود کہا کرتا تھا کہ میاں نصوح لاکھ دینداری جتائیں مگر جب جانیں کہ بڑے بیٹے کو اپنی راہ پر لائیں کلیم کو جو ننگے سر ننگے پاؤں سر بازار جاتے ہوئے دیکھا تو فطرت نے چھیڑ کر پوچھا کہ میاں کلیم تم نے ابھی سے احرام[3] حج باندھ لیا؟

کلیم۔ احرام حج نہیں۔ احرام ہجرت۔

فطرت۔ وہی تو کہوں۔ مجھ کو تمھاری وضعداری اور دانشمندی سے شیخ وقت کی تقلید نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی۔

---

[1] گناہ [2] سرکشی [3] زیارت کعبہ سے پہلے کسی مقررہ مقام سے سیئے ہوئے کپڑے نہ پہننا اور بعض چیزیں اپنے اوپر حرام کر لینا۔

کلیم ۔ جی نہیں شیخ کی خدمت میں جیسی ارادت شاعروں کو ہے معلوم؟
فطرت ۔ بس یہی دیکھ لو کہ بھائی نصوح کا اپنی اولاد کے ساتھ اور اولاد میں بھی تمھارے ساتھ کہ آج ماشاءاللہ فخر خاندان ہو، یہ طرز مدارات ہے ۔ ہم لوگ تو خیر، کہنے کو اجنبی اور غیر ہیں ایسی ہی بدمزاجیوں نے کنبہ والوں سے میل ملاپ چھڑایا ۔ ورنہ انصاف شرط ہے ۔ ہمارا اُن کا کیا بانٹے ؟ اپنا کھانا اپنا پہننا ۔ لڑائی کس لئے ؟ اور جھگڑا کیوں ؟ اور طرہ یہ ہے کہ جس قدر حضرت سن رسیدہ ہوتے جاتے ہیں ۔ مزاج جوان ہوتا جاتا ہے ۔ بھائی صد آفریں ہے تمھاری والدہ کو ۔ نہیں معلوم ایسے آتش مزاج ۔ بیمروت آدمی کے ساتھ اُس نیک بخت نے کیونکر نباہ کیا؟ مگر عورت ذات موذی کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہے ۔ کرے تو کیا کرے میاں کلیم تم اس کو سچ جاننا ۔ تم لوگوں کی مصیبت کو خیال کر کے بھائی ہمارا تو گھر بھر بے چین رہتا ہے ۔ یہ خون کا جوش ہے ۔ ورنہ ملنا ملانا ترک ۔ آنا جانا موقوف ۔ سلام پیام مسدود ۔ کیا کریں ؟ کچھ بس نہیں چلتا ۔ بھلا پھر اس حالت سے تم جاتے کہاں ہو؟
کلیم ۔ خالہ جان کے یہاں جانے کا ارادہ ہے ۔
فطرت ۔ تمھارے باپ کے ڈر سے دیکھا ہی چاہیئے کہ گھر میں گھُسنے دیں ۔
کلیم ۔ نہیں ۔ اُن سے تو ایسی توقع نہیں ہے ؟
فطرت ۔ مگر ذات شریف خود نہ تشریف لے جائیں ۔ اس کی کیا

روک ہے۔

کلیم۔ اس کا خدشہ تو ضرور ہے ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا حضرت سلام میرا

فطرت۔ میں کہہ تو نہیں سکتا۔ لیکن سمجھو تو، ہم بھی خدانخواستہ کوئی تمھارے، یا بھائی نصوح کے دشمن نہیں ہیں۔ ارے میاں! رشتہ داروں ہی میں کھٹ پٹ بھی ہوا کرتی ہے۔ شکوہ غیر کا نہیں کرتے۔ گلہ اوپری سے نہیں ہوتا۔ جو ہم کو تمھارا اور تم کو ہمارا درد ہو گا وہ خالہ خالو کو نہیں ہو سکتا۔ بھائی نصوح ابھی جب وبا میں بیمار پڑے خدا شاہد ہے دونوں وقت میں خود محلّے میں آ کر خبر لے جاتا تھا۔ ہماری اماں جان ہمیشہ حلال خوری[1] سے تمھارے یہاں کے حالات پوچھا کرتی ہیں۔ مجھ سے تو یہ رُسوائی گوارا نہیں ہو سکتی کہ تم اس حالت سے ایسے بےوقت خالہ کے یہاں جاؤ چلو شب کو ہمارے یہاں آرام کرو۔ ایسا ہی ہو گا تو صبح کو خالہ کے یہاں بھی ہو آنا۔ لو میرا دوپٹّہ تو سر کو لپیٹ لو۔ لوگ آتے جاتے ہیں اور چلو پاس کے پاس اُسی چھتّے سے ہو کر نکل چلیں۔ غرض میاں فطرت تلو پتّو کر کے کلیم کو اپنے گھر لے گئے اور نصوح کی جلن سے اُس کی ایسی بزرگداشت کی کہ کسی کے گھر والے بھی نہ کرتے ہوں گے۔ کلیم نے جب سے دینداری اور اصلاح وضع کی چھیڑ چھاڑ سُنی تھی۔ کیا ماں،

---

[1] بھنگن۔ مہترانی۔

کیا باپ، کیا بھائی، سب کو اپنی رائے سے برخلاف پایا۔ اب جو فطرت نے بغرض اُس کی دلجوئی اور خاطر داری کی۔ اُس کی ہاں میں ہاں ملائی اور نصوح کو مجنون اور بدمزاج اور سخت گیر ٹھہرایا، یہ احمق سمجھا کہ بس فطرت اور اُس کے گھر والوں سے بڑھ کر کوئی اُس کا خیر خواہ نہیں۔ اب تک وہ باپ سے صرف اختلاف رائے رکھتا تھا۔ اب اُس کو باپ سے ایک نفرت اور عداوت پیدا ہوئی۔ فطرت نے جلی کٹی باتیں لگا کر یہ خیال اُس کے دل سے بالکل دور کر دیا کہ نصوح کو اُس کے تدینؔ[1] نے اولاد کے ساتھ روک ٹوک کرنے پر مجبور کیا ہے اور چونکہ کلیم اپنی پندار میں یہی سمجھتا تھا کہ اس وقت تک میں ہی اکیلا گھر سے نکلا ہوں فطرت کے بہکا دینے سے اُس کو یقین ہو گیا کہ دینداری اور خدا پرستی کا حیلہ تھا ورنہ فی الاصل باپ کو اُس کا گھر سے نکال دینا مرکوز خاطر تھا، کلیم اُس وقت دو مخالفوں کی کشمکش میں تھا۔ باپ اُس کو صراطِ مستقیم[2] کی طرف کھینچتا تھا اور فطرت گمراہی اور ضلالت کی طرف۔ لیکن فطرت حریف، غالب تھا۔ اس واسطے کہ اول تو خود کلیم کا میلانِ طبع اُس کی جانب تھا۔ دوسرے نصوح ایک نئی اور نامانوس[3] اور دشوار گزار راہ پر اُس کو لے جانا چاہتا تھا۔ جس میں زہد و ریاضت اور اتقا اور نفس کشی اور انکسار اور فروتنی اور خوفِ عاقبت کی چند در چند تکلیفیں اور مصیبتیں درپیش تھیں۔ اس راہ میں کلیم کو بدرقہ و راہنما تو خیر، رفیق اور ہمسفر کا ملنا بھی مشکل تھا۔ برخلاف اس کے

[1] دینداری [2] سیدھا راستہ [3] جس سے انس نہ ہو۔ ناپسند۔

فطرت اُس کو ایک شارعِ[1] عام دکھاتا تھا۔ ایسا آباد کہ گویا اس سرے سے اُس سرے تک بازار لگا ہے اور نہ صرف منزل بہ منزل بلکہ قدم بقدم۔ تن آسانی اور عیاشی اور خودپسندی اور کبر اور بیفکری اور مطلق العنانی طرح طرح کی آسائشیں۔ اور انواع واقسام کی راحتیں موجود وتیار تھیں' اس راہ میں کلیم کو میلے کا حظ[2] یعنی سفر میں حضر کا لطف حاصل تھا۔ غرض کلیم میاں فطرت سے شیر وشکر کی طرح ملا۔ نصوح نے جب یہ خبر سُنی تو سخت افسوس کیا نہ اس وجہ سے کہ وہ فطرت سے عداوت رکھتا تھا۔ کیونکہ عداوت تو دینداری کے اعتبار سے بڑا گناہ ہے اور نصوح سے اُس کے ارتکاب کی امید نہیں کی جاسکتی تھی لیکن اُس کا یہ خدشہ کچھ بیجا نہ تھا کہ فطرت اصلاح میں کوشش نہیں کرے گا۔ فطرت کے یہاں کلیم کو اور تو کسی طرح کی تکلیف نہ تھی مگر اُس کی مرضی کی کتابیں یہاں نہیں ملتی تھیں تب اُس نے فطرت سے بیان کیا کہ دن بھر خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرایا کرتی ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے حالات میں ایک مثنوی کہنی شروع کردی ہے اور سَوسَوا سَو ۱۲۵ شعر بھی ہو گئے ہیں مگر فکرِ سخن بے اطمینانِ خاطر بن نہیں پڑتا۔ اگر آپ صلاح دیں تو میں اپنی چند کتابیں گھر سے منگوا بھیجوں؟

فطرت۔ مجھ کو بھائی نصوح سے توقع نہیں کہ وہ اسی رعایت بھی تمہارے حق میں جائز رکھیں۔ خصوصاً اس حال میں کہ تم میرے گھر ہو، میرے نزدیک تمہارا یہ جرم اُن کے مذہب میں تکفیر[3] کے لئے کافی ہے۔

---

[1] عام راستہ [2] لطف [3] کفر کرنا۔

مگر ہاں اپنی والدہ سے کہلا بھیجو۔ اُن کا قابو چلے گا تو البتہ دریغ نہ کریں گی۔

کلیم تو متردد تھا کہ کس سبیل سے کتابیں منگوائے مگر فطرت ازبسکہ عیّاری اور چالاکی کے مؤکّل اُس کے مُطیع تھے۔ خود بول اٹھا کہ "اجی یہ کون سی بڑی بات ہے مجھ سے کہئے تو بھائی نصوح کی چارپائی اُٹھوا منگواؤں اور ان کے فرشتوں کو خبر نہ ہو" غرض فطرت نصوح کے گھر گیا اور کسی ڈھب سے اُس نے سارا حال معلوم کیا اور وہ آگ جو نصوح نے کلیم کی کتابوں میں لگائی تھی فطرت نے کلیم سے جا لگائی۔ ایک تو خانہ ویرانی اُس پر فطرت کی آتش بیانی کلیم پر اِس آتش زنی کی خبر نے وہ اثر کیا جو حضرتِ موسیٰؑ پر آتشِ طور نے کیا تھا۔ سننے کے ساتھ ایسا بیخود ہو گیا کہ گویا بجلی گری۔ آپے میں آیا تو مزاج ایسا برافروختہ تھا کہ شاید نصوح اس وقت موجود ہوتا تو یہ مردک دست و گریبان ہو کر لپٹ جاتا۔ کوئی ناگفتنی جلی کٹی بات اُس نے اٹھا نہیں رکھی مگر لال پیلا ہو کر خاموش ہو رہا اور اس بات کے درپے ہوا کہ باپ سے اس کا انتقام لے۔ کلیم نے جو طریقے انتقام کے سوچے تھے وہ سخت بیہودہ تھے۔ جب اس نے اپنی تدبیروں کو فطرت پر عرض کیا تو اُس نے سب کی تحسین[1] کی اور کہا کہ ابھی تم نرے صاحبزادے ہو۔ میں تم کو ایسی تدبیر بتاؤں کہ ہم کینہ[2] و ہم خزینہ۔

کلیم۔ وہ کیا؟

فطرت۔ گانوں پر آخر تمہارا نام چڑھا ہوا ہے اُس پر دخل کرو۔

---

[1] احمق بنانا بیوقوف بنانا [2] کام کا کام بن جائے اور کچھ خرابی نہ ہو۔

کلیم - ع "این[1] خیال است و محال است و جنوں"
اُن کے متعدد کارندے اور نوکر چاکر اُس پر مسلّط ہیں -

فطرت - گانوں تمھارا تو نوکر اور کارندے تمھارے یا اُن کے ؟

کلیم - لیکن میں صرف اسم فرضی ہوں -

فطرت - اس کا ثبوت ؟

کلیم - ثبوت اُن کا قبض و دخل اور اُن کے روپے سے گانوں کا خرید ہونا -

فطرت - اُن کا قبض و دخل عین تمھارا قبض و دخل اور اُن کا روپیہ عین تمھارا روپیہ ہے - بائع[2] نے تمھارے نام سے رسید دی - گانوں میں پٹہ و قبولیت تمھارے نام سے ہوتا ہے - خزانہ سرکار میں مالگزاری تمھارے نام سے سیاہہ ہوتی ہے -

کلیم - جب سرے سے اسم فرضی ہوں تو نام کا ہونا میرے حق میں کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتا -

فطرت - لیکن اگر اسم فرضی ہونے سے انکار کیا جائے تو اس کی تردید کچھ آسان نہیں ہے -

کلیم - میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کیونکر ایک امر واقعی کی تکذیب[3] ہو سکتی ہے ؟

فطرت - ہاں یہ شاعری نہیں ہے ، دنیا داری ہے - اس کو ایک

---

[1] یہ خیال خیالِ محال ہے - نادانی ہے [2] بیچنے والا [3] جھٹلانا -

خاص سلیقہ درکار ہے۔

کلیم۔ غرض اس تدبیر کا پیش رفت ہونا تو ممکن نہیں معلوم ہوتا کوئی اور بات سوچئے۔

فطرت۔ جب تم سے ایسے سہل کام کا سر انجام نہیں ہو سکتا تو گھر سے نکلنے کا حوصلہ تم نے ناحق کیا۔ یہی اسم فرضی کا حق مجھ کو حاصل ہوتا تو سیر دکھاتا۔

کلیم۔ فرض کر لیجئے کہ آپ کو حاصل ہے۔

فطرت۔ کیونکر فرض کر لوں؟ جیسے تم اسم فرضی مالک ہو، ویسا ہی ایک فرضی بیعنامہ میرے نام کر دو تو البتہ میں فرض کر سکتا ہوں۔

کلیم۔ اگر ملکیت فرضی کا بیعنامہ کچھ بکار آمد ہو سکتا ہے تو گانوں کی کیا حقیقت ہے۔ میں تو سلطنت روم کا بیعنامہ آپ کے نام لکھ دوں۔ ع

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را[1]

فطرت۔ بھلا گانوں کتنے پر بیع کر دو گے؟

کلیم۔ کسی فرضی قیمت پر۔

فطرت۔ بھلا اُس کا اندازہ بھی۔

کلیم۔ فرض کیجیے کہ سَو روپیہ۔

فطرت۔ مجھ سے ہزار نقد لیجئے۔

کلیم۔ سچ؟

فطرت۔ سچ۔

---

[1] حافظ شیرازی فرماتے ہیں کہ "میں معشوق کے تل پر سمرقند و بخارا بخش دوں"۔

کلیم - واللہ بیچا -

فطرت - واللہ - لیا -

کلیم کو فطرت کی قسم پر بھی اعتبار نہ ہوتا تھا - فطرت نے گھر میں جا، ہزار روپے کا توڑا لا سامنے رکھ دیا - اُدھر روپے گنے گئے اور اِدھر بیعنامہ لکھ پڑھ کر تیار ہو گیا - کلیم نے سوچا کہ میں نے یہ سودا کیا کیا، ایک غنیمت[1] بارِدہ مُفت ہاتھ آئی - اس وقت تو بات کی پیچ کر کے فطرت نے روپیہ دیدیا ہے - ایسا نہ ہو پھر چھینے کرے - بہتر ہے کہ چل دیجئے - یہ سوچ روپیہ کا توڑا بغل میں داب کلیم رخصت ہوا تو سیدھا چاندنی چوک میں آیا محلدار خاں کا کمرہ اُسی روز خالی ہوا تھا کہ اُس نے سر قفلی[2] جا دی - دہلی جیسا شہر اور کلیم جیسا ناعاقبت اندیش اور مسرف اور اس طرح کا مال مُفت بات کی بات میں فرش فروش جھاڑ فانوس ساز و سامان نوکر چاکر سب کچھ موجود ہو گیا - یہانتک کہ اگلے ہی دن پہلے مشاعرے کی محفل اس کے بعد ناچ کا جلسہ ٹھہرا - جتنے یار آشنا تھے سب کے نام رقعے تقسیم ہوئے اور کلیم کے سارے شیاطین الانس پھر بدستور جمع ہو گئے - حتیٰ کہ وہ مرزا ظاہر دار بیگ بھی اتنے بڑے بے غیرت کہ خبر سُن کر دوڑے آئے، اور کلیم اتنا بڑا احمق کہ ایسا دھوکہ کھا کر پھر اُن سے صاف ہو گیا - جس کیفیت سے کلیم نے دو مہینے گزارے ناگفتہ بہ ہے، وہ بدکرداری کی تپ کہنہ رکھتا تھا، اب یہ دو مہینے گویا بحران[3] کے تھے - ہزار روپے کی کل جمع پونجی اور ایسا بے دریغ خرچ - تیسرا مہینہ شروع نہیں ہوا تھا کہ

[1] لوٹ [2] تھوڑا کرایہ پیشگی دیکر سرخط لکھ کر مکان کی تالی لینا [3] بخار کی اور طبیعت کی لڑائی -

ہزار تمام ہوئے۔ پہلے سے بھی، بزاز، درزی، حلوائی، کبابی، نانوائی، میوہ فروش، گندھی، بساطی وغیرہ کا حساب باقی تھا۔ نوکروں کا دوماہہ[1] چڑھ چکا تھا۔ اب آٹا دال تک اُدھار آنے لگا۔ شدہ شدہ ہر طرف سے طلب، وتقاضا شروع ہوا۔ استعمال سے پہلے اسباب خانہ داری کے بکنے کی نوبت پہنچی تو کلیم خوابِ غفلت سے بیدار ہوا لیکن اب اُس کا مُتنبہ ہونا کچھ چنداں سودمند نہ تھا اس کے یار دوست دستور کے موافق اُس کے پاس کا آنا جانا قاطبۃً ترک کر چکے تھے۔ نوکر چاکر بھی گھر بیٹھ رہے تھے اور چوتھے وہ تنخواہ کے نہ ملنے سے ایسے گستاخ ہو گئے تھے کہ کارِ خدمت تو درکنار رودررو جواب دیتے تھے۔ جو چیز جس کی تحویل میں تھی وہ ہیکڑی سے اس کو اپنا مال سمجھتا تھا۔ کوئی وقت نہ تھا کہ دو چار قرض خواہ اُس کے دردولت پر نہ ہوں۔ کلیم نے چاہا کہ چپکے سے چل دے مگر اُس کے بغلی دشمنوں یعنی نوکروں کی وجہ سے اُس کا منصوبہ فاش ہو گیا اور جوں ہی پہر رات گئے وہ نوکروں کا لباس بدل کر باہر نکلا تھا کہ سرہنگان دیوانی[2] کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہو گیا۔ اس غفلت شعار کو اب معلوم ہوا کہ کئی ڈگریاں یکطرفہ اُس پر جاری ہیں۔ ان پیادوں کی حراست میں جس کیفیت سے کلیم نے رات گزاری وہ ایسی سخت وناگوار تھی کہ اُس کو بار بار ظاہر دار بیگ کی مسجد کا اعتکاف شبینہ حسرت کے ساتھ یاد آتا تھا۔ اگلے دن کچہری کے وقت پیادوں نے کلیم کو لے جا کر حاکم عدالت کے روبرو حاضر کیا۔

---

[1] دو مہینے کی تنخواہ [2] دیوانی کے چپراسی۔

احاطہ کچہری میں پہنچتے ہی پہلے نصوح سے مڈبھیڑ ہوئی۔ کلیم باپ کو دیکھ کر بے اختیار رُو دیا مگر پیادوں کے خوف اور اپنی ندامت کے سبب کچھ نہ کہہ سکا۔ نصوح کا کچہری میں آنا بھی انھیں حضرت کی وجہ سے تھا۔ فطرت نے اُس بیعنامۂ فرضی کا ایک طومار بنا کھڑا کیا اور دو چار نمک حرام کارندوں کو گانٹھا اور چند کاشتکاروں کو بیگھ پیچھے ڈو ڈو چار چار آنے کمی کر کے استمراری پٹے[1] کر دیے۔ دلّی شہر کے چند بازاری آبرو باختہ[2] غنڈے ساتھ لے گانوں پر زبردستی دخل کر لیا۔ نوبت بعدالت پہنچی۔ مقدمہ میں کچھ ایسے پیچ پڑتے گئے کہ دروغ کو فروغ ہو گیا۔ کلیم نے تو اپنے نزدیک ایک کھیل کیا تھا۔ نصوح بیچارے کو مفت میں پانچ چھ ہزار کا گانوں ہارنا پڑا۔ اسی تقریب سے نصوح حاضر کچہری تھا کہ کلیم اُس کو دوسری مرتبہ سرکاری پیادوں کے ہاتھ میں گرفتار نظر آیا۔ گو باپ بیٹوں میں بالمشافہ بات چیت تو درکنار دُعا سلام کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن ایک کو دوسرے کی کیفیت معلوم ہو گئی۔ باپ نے ابھی کچہری کے احاطے سے پانوں باہر نہیں رکھا تھا کہ بیٹا جیل خانہ جا داخل ہوا۔ کلیم نے ہر چند شاعری اور امیر زادگی کے چند در چند استحقاق ثابت کیے مگر مالکانِ مجلس نے ایک نہ مانی اور اُس کو ایسا ایسا دِق[3] کیا کہ دوسرے ہی دن چیں بول گیا۔ اُس بیکسی میں کلیم کو باپ یاد آیا اور اگرچہ اپنی حرکات پر نظر کرنے سے اُس کو بالکل نااُمیدی تھی مگر اَلغَرِیقُ[4] یَتَشَبَّثُ بِالحَشِیشِ، مرتا کیا نہ کرتا،

---

[1] ہمیشہ کے لئے [2] بے عزت [3] دق کیا [4] ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا پکڑتا ہے۔

بغیرتی کا ٹھیکرا آنکھوں پر رکھ کر باپ کو ایک خط لکھا - وہ یہ تھا۔

خط

مجھ کو حیرت ہے کہ میں کون ہوں اور کس کو یہ خط لکھتا ہوں - اور یقین ہے اس خط کے پہنچنے پر مجھ سے زیادہ حیرت آپ کو ہوگی - اتنی گستاخی، اتنی نافرمانی، اتنی بےحیائی - اتنی مخالفت پر چونالائق، نابکار، ناہنجار، کشتنی، گردن زدنی، ننگ خاندان ع

بدنام کنندۂ[1] نکونامے چند

سے سرزد ہوئی - میں کیا کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کے ساتھ نسبت فرزندی باقی رہی - پس نہ تو یہ خط، خط ہے اور نہ بیٹے کی طرف سے ہے، اور نہ باپ کے نام ہے - بلکہ یہ معذرت نامہ ہے - عرضیٔ اعتراف ہے، توبہ کا وثیقہ اور استغفار کی دستاویز، ندامت کا اقرار اور حاجتمندی کا اظہار ہے - گنہگار، روسیاہ، شرمسار، ظالم، جفاکار، تبہ روزگار، کلیم کی طرف سے صاحبِ کرم عمیم[2] و خُلق عظیم، بُردبار و حلیم - رؤف[3] رحیم - محسن[4] ولی نعمت - مہربان سراپا - شفقت نیکوکار - کم آزار - خیرخواہ بلااشتباہ کے نام - ہرچند میری رُسوائی یہاں تک پہنچی کہ جب سے مردُود[5] و مطرُود[6] ہوا طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا اور انواع واقسام کی ذلتوں میں گرفتار ہوں لیکن یہ سمجھنا کہ میں نے جیسا کیا ویسا پایا - بجا اور غلط ہے - کیا ہزار

---

[1] چند نیکوں کا بدنام کرنے والا [2] عام مہربانی کرنے والا [3] رحمدل پرورش کرنے والا۔ [4] احسان کرنے والا - جس نے اپنی نعمت سے پالا پوسا [5] لعنتی [6] دھتکارا ہوا۔

توپایا ایک - کیا من تو بھگتا چھٹانک ، بلکہ ایک ، اور چھٹانک بھی ، حاشا نہیں - زنہار نہیں - ہر چند میں معذرت کرتا ہوں اور جو کچھ میرے دل میں ہے ، وہ کہیں زیادہ ہے - اُس سے جو عبارت میں ہے لیکن خود مجھ کو اپنی توبہ سے تشفی اور ندامت سے تسلی نہیں - اس واسطے کہ میری توبہ درماندگی کی توبہ اور ندامت حالتِ ابتلا[1] کی ندامت ہے توطیہ[2] برطرف تمہید یکسو ، نہ مجھ کو توبہ پر تکیہ نہ ندامت پر ناز ، خدا کو جس کا میں آپ سے بڑھ کر گنہگار رہوں اپنا شفیع[3] قرار دیتا ہوں - ع

اور دیکھتا ہوں تا کرم او چہا کند[4]

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ[5]

رباعی

شاہا ز کرم بر من درویش نگر	بر حال من خستہ و دلریش نگر
ہر چند نیم لائق بخشائش تو	بر من منگر بر کرم خویش نگر[6]

سلیم کسی پادری سے ایک مذہبی کتاب لے آیا تھا اُس میں اتفاق سے ایک جملہ مجھ کو نظر پڑا اور پسند آیا وہ یہ تھا کہ توبہ ربڑ ہے اور گناہ پنسل کی تحریر - پس جبکہ توبہ و ندامت نے مجھ کو آلودگی گناہ سے پاک کر دیا تو پھر

---

[1] آفت زدہ [2] تقریب تمہید [3] شفاعت کنندہ [4] دیکھتا ہوں کہ اس کا کرم کیا کرشمہ دکھاتا ہے [5] غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے [6] اے بادشاہ مجھ فقیر پر کرم کی نگاہ سے دیکھ مجھ درماندہ اور شکستہ دل کے حال پر نظر کر گو میں اہل نہیں مگر تو اپنے کرم پر جا۔

میں آپ کا برخوردار ہوں ۔ اور آپ میرے والد بزرگوار مجھ کو آپ سے ہر طرح کا دعویٰ اور آپ کو مجھ سے ہر قسم کی توقع سات سو روپیہ کے عوض میں اس وقت میری جان پر بنی ہے آپ مجھ کو اگر للہ صدقہ زکوٰۃ خیرات جان کر نہ دیں تو قرض حسنہ دیں ۔ قیدی کے چھڑانے غلام کے آزاد کرنے کا ثواب آپ پر مخفی نہیں ہے ۔ اگر روپیہ کل تک نہیں آیا تو میری زندگی دشوار ہے ۔ کلیم شاعر تو تھا ہی باتوں کا جادو بنانے کی اس نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی تھی کہ اُس کے جھوٹے ڈھکوسلوں پر تمام مجلس کو وجد ہوتا تھا باپ کے لئے اُس نے تو یہ رہائی کا ایسا مضمون سوچا کہ اُس کا خط گویا سات سو روپیہ کی درشنی ہنڈی تھی ۔ جانے کی دیر تھی اور روپیہ ملنے کی دیر نہ تھی ۔ لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ قاصد نہیں نامہ بر نہیں ، خط جائے تو کیسے جائے ۔

ہانسی حصار کی طرف کا ایک سپاہی کچھ حرف آشنا سا تھا اور جب اُس کو پہرہ وغیرہ سے فراغت ہوتی تو وہ قصہ شاہ روم ، سپاہی زادہ ، بنجارہ نامہ ، کنز المصلّی منظوم اس قسم کے اُردو رسالے نثر کو پریشان نظم کو ناموزوں کر کے اپنی کرخت سنگلاخ بولی میں پڑھا کرتا تھا ۔ کلیم کو شاعری کے ذریعے سے اُس سپاہی کے ساتھ تعارف پیدا کر لینا کچھ دشوار نہ تھا ۔ منت سماجت سے کلیم نے اُس کو خط پہنچا دینے پر آمادہ کیا اور اجرت یہ ٹھہری کہ کلیم اُس کے اور اُس کے دو بیٹوں کے نام کے سجے[1]

[1] نام کو اس طرح سجانا کہ وہ شعر کا جزو مطلب ہو جائے ۔

بنا دے۔ نام اُن کمبختوں کے اتفاق سے ایسے ٹیڑھے تھے کہ بیچارہ کلیم بہتیرا غور کرتا تھا۔ کسی ڈھب سے نہیں کھپتے تھے۔ اور واقع میں ننھّے خاں جمنّ خاں، بدھو خاں کے ناموں کے سجعے کوئی کہے تو کیا کہے۔ اُس پر خرابی یہ کہ ننھّے خاں جاہل، کندۂ ناتراش پسند کرنے والا۔ سخن فہم کلیم بہتر سے بہتر سجع کہہ کر لے جاتا وہ سُن کر ہنس دیتا اور کہتا کہ "بھائی جی! یہ تو ٹھیک نہیں بیٹھا۔ بڑی بڑی خرابیوں سے کوئی چھ سات دن میں کلیم نے ننھّے خاں کی فرمائش پوری کی۔ غرض کلیم کا خط باپ تک پہنچا۔ وہ اس طرح کی طلب نہ تھی کہ اُس میں امروز فردا کی گنجائش ہو۔ نصوح نے خط پڑھنے کے ساتھ ساتوں سو روپیہ بے عذر گن دیے۔ کلیم اس مرتبہ بھی باپ سے نچو کا ضرورت تھی پانسو کی اور منگوائے سات سو۔ پانسو دے کر تو رہائی پائی باقی بچے دو سو، اُس میں کھڑے کھڑے سامانِ سفر درست کر اُسی وقت دولت آباد کا راستہ لیا۔

فصل یازدہم

کلیم نوکری کی جستجو میں دولت آباد گیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا لڑائی میں زخمی ہوا اور مُردوں کی طرح چار کہاروں پر لد کر دہلی آیا

یہ ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست ہے البتہ کوئی پانچ چھ لاکھ روپیہ سال کا محاصل[1] اس میں ہو سکتا تھا لیکن ایک نوجوان ناتجربہ کار مسند نشین ہوا۔ خوشامدی صلاح کار، لچے مصاحب موقع پا کر آ جمع ہوئے اور دولت آباد کو چھوٹا لکھنؤ[2] بنا دیا۔ جہاں جہاں اس مذاق کے لوگ تھے۔ سب کو فری میشن[3] کی طرح ریاست دولت آباد کے حالات معلوم تھے۔ کلیم بھی سُن سُن کر دولت آباد کا ایسا مشتاق تھا۔ جیسے زاہد مرتاض[4] جنت کا۔

---

[1] آمدنی [2] دربار لکھنؤ کی عیاشی مشہور بات ہے [3] ایک انگریزی مجلس ہے جس کا ہر بھید پوشیدہ اور اس کے ممبروں کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو ممبر جانتا ہے وہ نہیں معلوم کس وجہ سے بتا نہیں سکتا [4] دُنیا کو ترک کر کے عبادت کرنے والا۔

غرض کلیم دو منزلہ طے کرتا ہوا دولت آباد پہنچا اور قبل اس کے کہ کسی سے تعارف پیدا کرے اُس نے اپنا سامان ظاہر درست کر، ایک سرائے میں امیری ٹھاٹھ لگا دیے۔ مدح رئیس میں قصیدہ تو اُس نے سفر ہی میں کہنا شروع کر دیا تھا۔ صرف عرض حال اور قطعۂ دُعائیہ باقی تھا۔ جلدی جلدی تمام کر اسی قصیدہ کو ذریعۂ تقریب قرار دے، در دولت پر جا حاضر ہوا۔ مگر شامت اعمال اور باپ کی ناخوشی کا وبال اُس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے دولت آباد میں چند روز پہنچنے سے پہلے یہاں بساط الٹ چکا تھا۔ بدنظمی ریاست کی خبریں صاحب رزیڈنٹ کو پہنچیں۔ اور اُنھوں نے بذات خاص دولت آباد پہنچکر رئیس سے کل اختیارات منتزع کر امور ریاست کا اہتمام ایک کمیٹی کو تفویض[1] کیا جس میں ریاست کے چند قدیم نمک خوار تھے کہ وہ رئیس کی بے اعتدالیاں دیکھ کر ترک خدمت کر کے گھر بیٹھ رہے تھے اور اس کمیٹی کے میر مجلس انتظام الدولہ مرفہ الملک نواب بیدار دل خاں بہادر والی عافیت نگر قرار دیے گئے کہ وہ رشتے میں رئیس دولت آباد کے ماموں بھی ہوتے تھے اور اُنکا حُسن انتظام ان اطراف میں ضرب المثل تھا۔ اور خود صاحب رزیڈنٹ بہادر بھی بلا ناغہ ماہ بماہ اپنی شرکت سے کمیٹی کی آبرو افزائی کیا کرتے تھے۔ رئیس کو مصارف ضروری کے لئے کمیٹی سے دست برداشتہ کچھ روپیہ ملتا تھا۔ نابکار مصاحب ایک ایک کر کے نکالے جا چکے تھے۔

[1] سپرد کرنا۔ سپرد کرنا

غرض جس چاٹ پر کلیم دوڑا آیا تھا وہ بات اب باقی نہ تھی۔ ناواقفیت کی وجہ سے کلیم نے اطلاع کرائی تو فوراً صدا کی طرح طلبی آئی۔ یہ تو اس توقع سے خوشی خوشی اندر گیا کہ بانکے ٹیڑھے رنگیلے چھبیلے وضعدار لوگ دیکھنے میں آئیں گے مگر جا کر دیکھتا ہے تو بڑے بڑے ریشائیل[1] مولوی پگڑ اور عمامے باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی درس دے رہا ہے۔ کوئی کتاب دیکھ رہا ہے کوئی اوراد[2] میں مصروف ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی کلیم نے یہ برجستہ مطلع پڑھا ؎

جاتے تھے جستجوئے بتخانہ وصنم میں
بھکے تو جا کے نکلے ہم بھی کہاں حرم میں

مولویوں کی شکل دیکھ کر قریب تھا کہ کلیم اس طرح بھاگ کھڑا ہو۔ جیسے لاحول سے شیطان مگر اس کو خیال ہوا کہ امیروں کے کارخانے ہیں عجب کیا ہے کہ یہ کوئی خانقاہ ہو ع

مسجد کے زیر سایہ خرابات[3] چاہیئے

چلو ذرا حال تو دریافت کریں۔ بارے قریب جا کر اُس نے ایک پیر مرد کو مُجرا[4] عرض کرتا ہوں کہہ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ لفظ مجرا اُسن کر اُن بزرگ کے کان کھڑے ہوئے اور فوراً آنکھ سے عینک اُتار سیدھے ہو کر کلیم کو دیکھنے لگے تو اُس نے زاید از رکوع جھک کر ان کو سلام کیا یعنی اپنا مجرا

---

[1] بڑی بڑی لمبی داڑھیوں والے [2] وظیفے [3] خراب خانہ [4] بڑے تپاک کا لکھنوی انداز کا سلام۔

دکھایا۔ اس بزرگ نے فرمایا۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مِنْ اَیْنَ اَتَیْتَ[1] فَالُکَ اَحْسَنَ اللّٰہُ بِحَالِکَ[2]۔

کلیم۔ حضرت قبلہ میں فہم عربی سے قاصر ہوں۔

مولوی صاحب۔ کہاں سے اتفاق مجئی[3] ہوا؟

کلیم۔ دہلی سے۔

مولوی صاحب۔ تقریب؟

کلیم۔ امتحان بخت اور آزمائش نصیب۔

مولوی صاحب۔ علم و عمل؟

کلیم۔ مدحت[3] طرازی ارباب[4] دول۔

مولوی صاحب۔ غرض و غایت؟

کلیم۔ تحصیل[5] جاہ و ثروت

تب اُس بزرگ نے مختصر طور پر کلیم کو وہاں کے حالات سے مطلع کر دیا اور کہا کہ رئیس لاشئے[6] محض ہے وہ بھی لابشرط شے نہیں بلکہ بشرط[7] لاشئے اور بے اجازت خاص حضرت مولانا صدر اعظم کے کسی کو اُس تک پہنچنے کا امکان نہیں۔

کلیم۔ صدر اعظم صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں؟

---

[1] تم کہاں سے آتے ہو [2] خدا تمہارے حال پر رحم کرے [3] آنے کا [3] تعریف کرنا [4] دولت مندوں کی [5] مرتبہ اور دولت حاصل کرنا [6] کچھ چیز نہیں [7] یہ اشارہ منطق کے ایک مسئلہ کی طرف ہے۔

مولوی صاحب - دیکھو یہیں کہیں ہوں گے۔

کلیم - ان کی شناخت؟

مولوی صاحب - سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ[1]

کلیم - میں نہیں سمجھتا۔

مولوی صاحب - ایک بڈّھے منحنی[2] سے آدمی ہیں۔ نیلی لُنگی اوڑھے ہوئے حجرۂ شمالی کے صحن میں طلبہ کو درس دے رہے ہوں گے۔ یا فصلِ[3] خصومات میں مصروف ہوں گے۔

کلیم - اُن کو کیا خدمت ہے؟

مولوی صاحب - جیسے حرفِ[4] ندا لفظ ادعوا کا قائم مقام ہوتا ہے اسی طرح مولانا صاحب ادام اللہ فیوضہم نائب الرئیس ہیں۔

کلیم - میں اُن کی خدمت میں جا سکتا ہوں؟

مولوی صاحب - لاباس[5] بہ۔

غرض کلیم صدر اعظم صاحب کی خدمت میں گیا۔ تو وہ اُس کی نظر میں کچھ بھی نہ جچے، یہ سمجھا تھا کہ وزیر اعظم اور نائب الرئیس ہیں تو بڑے کرّ و فر کے ساتھ ہوں گے۔ وہاں جاکر دیکھا کہ ولایتی نما ایک بڈھے سے مولوی ہیں۔ وراثت کا ایک جھگڑا اُن کے روبرو درپیش ہے اور بیٹھے اپنے ہاتھ سے حساب مناسخہ[6] لگا رہے ہیں۔ کلیم کو ایک اجنبی صورت دیکھ کر

---

[1] اُن کا حلیہ یہ ہے کہ پیشانیوں پر سجدے کے گھٹے پڑے ہیں [2] دُبلے پتلے [3] جھگڑے چکانے [4] یہ ایک علم نحو کا مسئلہ ہے [5] کچھ مضائقہ نہیں [6] قانون فرائض

اُنھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ ان لوگوں سے فارغ ہوں تو آپ سے بات کروں۔ جب تک مقدمہ پیش رہا کلیم غور سے دیکھتا اور سنتا رہا۔ مولوی صاحب بلا کی موشگافیاں[1] کر رہے تھے۔ تب تو کلیم نے سمجھا کہ واقع میں یہ شخص بڑے پایہ کا آدمی ہے۔ اور منصب وزارت کے قابل ہے۔ بارے جب مقدمہ طے ہو چکا تو صدر اعظم صاحب کلیم کی طرف مخاطب ہوئے کہ "ہاں حضرت فرمایئے"۔

کلیم۔ بندہ ایک غریب الوطن ہے۔ رئیس کی جود و سخا کا شہرہ سُن کر مدت سے مشتاق تھا۔ یہ حال ہے۔ باقی میری صورت سوال ہے۔

صدر اعظم۔ آپ کی سماعت صحیح لیکن اگرچہ جود صفتِ محمود[2] ہے مگر اعتدال شرط ہے۔ شامت اسراف سے غنی باقی نہ رہا۔ فرنگیوں نے حفظِ ریاست کی نظر سے رئیس کو ممنوع[3] التصرفات مسلوب الاختیارات کر رکھا ہے۔

کلیم۔ میں طالب گنجینہ نہیں سائل خزینہ نہیں ہے

صدف کو چاہیئے کیا ایک قطرہ چشمۂ یم[4] سے

بجھا لیتا ہے اپنی پیاس کام غنچہ شبنم سے

کلیم نے اس طرح کڑک کر بیدھڑک شعر پڑھا کہ تمام حاضرین اُس کی یہ حرکت خارج از سیاق[5] ادب دیکھ کر متعجب ہوئے۔ صدر اعظم صاحب کا منصب، اُن کا علم و فضل، اُن کی پیری اور ہیبت جو اُن کی تہذیب کو لازم تھی یعنی صدر اعظم صاحب کی حالتِ مجموعی اور اس سے قطع نظر خود کلیم کی حالت اس کی مقتضی تھی کہ وہ پاس اَدب ملحوظ رکھتا۔ مگر وہ ایسی ہی بیبا کی کو

[1] بال کی کھال نکالنا [2] قابل تعریف [3] جو تصرف سے روکا گیا ہو [4] دریا [5] قواعد ادب۔

کچھ ہنرلسانی اور صفتِ حاضر جوابی سمجھتا تھا۔ شعر اُس کا تکیہ کلام تھا۔ بات کہتا تو مقفیٰ[1] کلام کرتا تو موزوں گفتگوئے روز مرہ میں بھی اُس کی یہی کیفیت تھی اور جو کوئی کبھی اُس کو ٹوکتا تو وہ جواب دیتا کہ ع

شاعری تو شعار ہے اپنا

کلیم کو صدر اعظم کے حضور میں بیباکانہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی۔ لیکن جو امر اُن کی حیرت کا موجب تھا وہی اُن کو کلیم کے روکنے اور باز رکھنے سے بھی مانع تھا۔ یعنی صدر اعظم صاحب کی ہیبت لوگوں سے زیادہ صدر اعظم صاحب کو حیرت ہوئی ہوگی۔ مگر اُن کی تہذیب اس درجہ کی تھی کہ انھوں نے کلیم کو نظر بھر کر بھی تو نہیں دیکھا۔ اظہار ناخوشی و ناپسندیدگی تو بڑی بات ہے۔

صدر اعظم۔ رئیس سے تو توقع سبقت ہے مگر انتظام جدید در پیش ہے۔ اگر میں سمجھوں کہ کوئی خدمت آپ انجام دے سکیں گے تو انشاء اللہ مجلس شوریٰ میں جس کو لوگ کمیٹی منتظم ریاست کہتے ہیں، آپ کے استحقاق پیش کر دیے جائیں گے اور غالب ہے کہ کوئی خدمت آپ کو مفوض[2] ہو جائے۔ متعدد مناصب[3] خالی ہیں۔ خصوصاً انتظام فوجداری حدود ریاست میں۔

کلیم۔ چندے حضور مجھ کو اپنی خدمتِ خاص میں رکھیں اور اس نالائق کی ہنرمندی اور بے ہنری حضور پر منکشف ہو جائے۔ پھر جس خدمت کیلئے ارشاد ہوگا بسر و چشم اُس کو بجالائے گا اگرچہ خدمتِ فوجداری ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] قافیہ دار [2] سپرد [3] منصب کی جمع بمعنی رتبہ۔

طالب ہوں علم کا کہ علم سے ہے ہم رقم
نیزہ سمجھ کے لیتا ہوں میں ہاتھ میں قلم

صدر اعظم۔ فرنگیوں نے جو انتظام کیا ہے وہ ایسی تنگ ورزی کے ساتھ کیا ہے کہ اُس میں بہت تھوڑی گنجائش ہے پس قبل اس کے کہ میں آپ کو اپنے پاس کی کوئی خدمت دوں مجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کس کام کی انجام دہی پر قدرت رکھتے ہیں؟

کلیم۔ بقول غالبؔ ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گو و خوش گفتار

صدر اعظم۔ لیکن انتظام جدید کے مطابق ریاست میں کوئی خدمتِ شاعری باقی نہیں۔

کلیم۔ ؎ گر سخن گو نہیں تو خاک نہیں
سلطنت ہے عروس بے زینت

صدر اعظم۔ جو کچھ آپ سمجھیں۔

کلیم۔ لیکن ریاست پر کیا منحصر ہے حضور بھی تو وزیر اعظم اور نائب الرئیس ہیں۔ آپ کی سرکار میں کیا کمی ہے؟ ع

بعد[1] از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

صدر اعظم۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ[2] مِنْ اٰفَاتِ اللِّسَانِ۔ میں بیچارہ نام کا

---

[1] رئیس کے بعد آپ ہی بڑے ہیں اور بس [2] میں خدا سے زبان کی آفتوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

نائب الرئیس اور وزیر ہوں ورنہ فی الحقیقت ایک ذرہ حقیر ہوں۔

کلیم۔ یہ حضور کا کسر نفس ہے بقول ظہوری ؎

سر[1] خدمت بر آستاں دارد
پائے رفعت بر آسماں دارد

میں بھی اس بلاد[2] دُور دست اور دیار اجنبی میں اتفاق سے آنکلا ہوں اور میں دیکھتا ہوں تو آپ کی سرکار با اقتدار میں ایک شاعر کی ضرورت بھی ہے جو آپ کے محامد او صاف[3] کو مشتہر کر کے خیر خواہان دولت کو راسخ العقیدت اور دشمنانِ روسیاہ کو مبتلائے ہیبت کرتا رہے۔

صدر اعظم۔ یہ آپ کی کریم النفسی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم[4]۔ مجھ کو اگر ضرورت ہے تو ایسے شخص کی ہے جو مجھ کو میرے عیوب پر مطلع کیا کرے۔

کلیم۔ اگر مدح و ستائش پسند نہیں ہے تو بندہ وصل و ہجر و شوق و انتظار و ناز و نیاز و واسوخت و رباعی و تاریخ و سجع و چیستان و معاملہ بندی و تضمین و محاکمہ و رزم و بزم و تشبیہ و استعارات و تجنیس و تمثیلات وسراپا ہر طرح کے مضامین پر قادر ہے جو طرز مرغوب طبع ہو اُسی میں طبع آزمائی کرے گا ؎

رکھتا اگرچہ عیب تعلّی[5] سے عار ہوں
بس مغتنم[6] ہوں منتخب روزگار ہوں

صدر اعظم۔ آپ کے ہنر مند بےنظیر و بے مانند ہونے میں شک نہیں لیکن

---

[1] خدمت کی وجہ سے آستانے پر سجدہ کر رہے ہیں مگر اصل میں آسمان پر پاؤں ہے [2] شہر [3] ملک [4] عمدہ صفات [5] اپنے آپ کو میں ہی خوب جانتا ہوں [6] جھوٹی بڑائی [7] غنیمت

افسوس ہے کہ مجھ کو اس فن کی طرف رغبت نہیں۔

کلیم۔ حضور جیسے عالم باکمال کا ایسے فن شریف سے ع

کہ ہم حظ[1] نفس است و ہم قوت[2] روح

رغبت نہ رکھنا۔ ع میری قسمت کی نارسائی ہے

صدر اعظم۔ اگرچہ میں اپنے نفس میں انواع و اقسام کی خباثتیں پاتا ہوں لیکن خداوند کریم کا اتنا شکر گزار ہوں کہ اب تو خیر ایسی باتوں سے محترز رہنے کی میری عمر ہی ہے۔ عنفوانِ شباب میں بھی خدا کے فضل سے میں ایسی باتوں کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔

کلیم۔ ع سبب کیا، وجہ کیا، موجب جہت کیا؟

صدر اعظم۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایسے مضامین میں اشتغال و انہماک رکھنے سے ذہول[3] و غفلت استخفاف[4] معصیت۔ استحسان[5] لہو ولعب اختیار[6] مالا یعنی کے سوائے کچھ اور بھی حاصل ہے؟

کلیم۔ اب اس خصوص میں کچھ عرض کرنا سوء ادب[7]۔ وہی خدمت فوجداری مجھ کو تفویض فرمائی جائے۔

صدر اعظم۔ مجھ کو کچھ عذر نہیں مگر آپ مجھ سے استشارہ[8] کریں تو بحکم اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ[9] میں صلاح نہیں دے سکتا اس واسطے کہ

---

[1] دل کو بھی مزا آتا ہے [2] روح کو بھی غذا ملتی ہے [3] بھول جانا [4] گناہ کو ہلکا جاننا [5] کھیل کود کو اچھا سمجھنا [6] ناقابل کو اختیار کرنا [7] بے ادبی [8] طلب رائے [9] صلاح کار امانت دار ہوتا ہے۔

رئیس کے ضعف حکومت نے اُن ٹھاکروں کو جو مستقر الریاست سے دور رہتے ہیں ایسا عسیر الانقیاد کر رکھا ہے کہ کوئی قسط بے جنگ جدال وصول نہیں ہوتی اور ملازمان فوجداری کو ہمیشہ اُن کے ساتھ معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے۔ آپ کے ذمہ ریاست کے حقوق سوابق نعمت ثابت نہیں کیا ضرورت ہے کہ ابتداءً ایسی خطرناک خدمت اختیار کی جائے۔

کلیم۔ حالت اضطرار کو کیا کیا جائے؟

صدر اعظم۔ اگر اضطرار ہے تو بیس روپیہ ماہانہ کا جمع خرچ نویس مداخل ایک منصب جدید ہونے والا ہے۔ چندے آپ اُس پر قناعت کریں۔ میرے نزدیک کنج عافیت کے یہ بیس فوجداری کے پچاس پر ترجیح رکھتے ہیں۔

کلیم۔ یہ حضور کی مسافر نوازی ہے لیکن بندہ اس خدمت سے معاف رکھا جائے ع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔

یہ کچھ لالہ بھائیوں کو ہی زیبا ہے۔

صدر اعظم۔ اتماماً للحجۃ پھر آپ سے کہتا ہوں کہ جس خدمت کے آپ خواستگار ہیں فی نفسہ خصوصاً اس وقت میں محل خطر ہے۔

کلیم۔ ع از خطر نیندیشد ہر کہ ہمتش عالی ست

صدر اعظم۔ اچھا تو آپ مآل کار کی نسبت تامل صحیح کر لیجئے۔ پھر

---

۱ رئیس کا مسکن ۲ مشکل سے حکم ماننا ۳ گذشتہ احسان ۴ ہر آدمی کو ایک کام کے لئے بنایا گیا ہے ۵ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے وہ خطرے سے نہیں ڈرتا۔

دیکھا جائے گا۔

غرض کلیم صدر اعظم سے رخصت ہو کر اپنی جگہ واپس آیا۔ مگر حصول مطلب سے مایوس۔ صدر اعظم سے بد عقیدت۔ یہاں سرائے میں بعض لوگوں نے اُس سے صدر اعظم کی ملاقات کی کیفیت پوچھی تو اُس نے نہایت حقارت سے کہا "اجی بس شعر فہمی عالم بالا معلوم شد"۔ آوازِ دہلِ[1] دور چوں دُم برداشتم مادہ خر برآمد۔ کوڑ مغز۔ جسد بے روح۔ جماد بے حس۔ افسردہ دل مردہ ع سگ نشیند[3] بجائے گیپائی۔

زمانۂ ناہنجار کے انقلاب دیکھئے۔ ایوانِ ریاست کیا ہے فتحپوری کی مسجد ہے۔ اگرچہ کلیم کو ایسی دل برداشتگی بہم پہنچی تھی کہ وہ کسی طرح ریاست کی نوکری پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ اُس کے پاس اتنا خرچ نہ تھا کہ کسی دوسری جگہ کا قصد کرے۔ حاجت اُس کو صدر اعظم کے پاس جانے پر مجبور کرتی تھی۔ مگر مخالفت رائے اُس کو مانع ہوتی تھی، یہاں تک کہ اسی حیص بیص میں پورے دس دن گزر گئے۔ اور کمیٹی منتظم ریاست کے انعقاد کا وقت آپہنچا۔ لیکن اس بندۂ خدا نے صدر اعظم کی طرف رخ نہ کیا۔ بارے یکایک نہیں معلوم کیا خیال اُس کے دل میں آیا کہ سپاہیانہ لباس پہن، ہتھیار لگا۔ مونچھوں پر تاؤ دے خدمت فوجداری کا امیدوار بن کر کمیٹی کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ آدمی تھا ماشاء اللہ وجیہ

---

[1] ڈور کے ڈھول سہاؤنے دُم اٹھا کر دیکھتا ہوں تو گدھی [2] بے جان پتھر [3] جیسے باورچی کی جگہ کتا آبیٹھے

اور اُس پرلستان ایک دم سے فوج کا کپتان مقرر ہو گیا۔ شاعروں کو ایک پھٹکار یہ ہوتی ہے کہ اکثر خود پسند ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ تعریف و آفریں اور داد و تحسین کے اُمیدوار رہتے ہیں۔ کلیم بھی اس مرض میں مبتلا تھا۔ اب جو اُس کو دفعۃً منصب کپتانی مل گیا تو اُس کی نخوت کو تائید مزید پہنچی۔ بقول میر ع

سمندِ ناز پر اک اور تازیانہ ہوا

جب دیکھو اردلی میں دس پندرہ سوار شہر میں گھوڑے کُدائے پھر رہے ہیں چار پانچ مہینے کلیم نے بڑے چین میں گزارے اور چونکہ باپ کو چھیڑنا منظور تھا۔ دہلی میں دوست آشناؤں کے پاس کپتان صاحب کے خط پر خط چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ زور آور سنگھ ایک ٹھاکر نے اپنے علاقہ کی قسط وقت پر نہ ادا کی۔ تنگ طلبی ہوئی تو وہ پھر بیٹھا۔ اُس کی سرکوبی کے واسطے دولت آباد سے فوج روانہ ہوئی۔ اُس میں کلیم بھی تھا جوانی کی عمر، نئی نئی نوکری، مزاج میں بیباکی و تہوّر۔ پہلے ہی حملہ میں میاں زخمی ہوئے تو کیسے سخت کہ دستم بخیر گھٹنے کی چپنی پر گولی بیٹھی تو اندر ہی اندر بنِ ران تک تیر گئی۔ نہیں معلوم نسوں میں کس طرح کا تعلق خدائے تعالیٰ نے رکھا ہے کہ ایک پانوں کے مجروح ہونے سے سارے کا سارا دھڑ بیکار ہو گیا قاعدہٗ فوج کے مطابق میدان جنگ سے لوتھ کو اٹھا کر دار الشفا میں پہنچایا۔ جراحوں نے زخم کو دیکھا تو ایسا کاری پایا کہ فوراً پانوں کاٹنا لازم آیا۔ اگرچہ اُس وقت تک جرّاحوں نے پانوں کو

جان کا فدیہ تجویز کیا۔ لیکن کلیم بیچارہ ناز و نعمت کا پلا ہوا تھا۔ اُس صدمہ کا متحمل نہ ہو سکا اور روز بروز اُس کی حالت ردی ہوتی گئی۔ تپ آنے لگی۔ زخم بگڑا۔ ناسور پڑے۔ اتنا بڑا ڈھو جوان ایک ہی مہینے میں گھُل گھُل کر پلنگ سے لگ گیا۔ جب پانوں کی طرح اس کی زیست کی امید منقطع ہو گئی تو ناچار لوگوں نے اس کو دہلی میں پہنچانے کی صلاح کی اور یہ بھی خیال ہوا کہ گھر کے جانے کی مسرت اور تبدیل آب و ہوا کی فرحت سے عجب نہیں کہ اس کے دل کو تقویت پہنچے۔ صدر اعظم صاحب حسبۃً للہ متکفل مصارف ہوئے اور دولت آباد سے دہلی تک برابر کہاروں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ کلیم دہلی میں پہنچا تو گو راہ میں انیس[19] بیس[20] کا فرق اُس کی حالت میں ہو گیا تھا۔ مگر ناتوانی اس درجہ کی تھی کہ دن رات میں سات پہر بیہوشی میں گزرتے تھے جب کہاروں نے اُس کی ڈولی نصوح کے دروازے پر جا اُتاری تو اُس پر غشی طاری تھی۔ نصوح بالاخانہ پر مصروف عبادت تھا۔ پہلے زنان خانہ میں خبر ہوئی فہمیدہ بیتاب ہو کر بے حجاب باہر نکل آئی جو پالکی کے پٹ کھولکر دیکھا تو بیٹے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اس طرح بلک کر روئی کہ سننے والوں کے کلیجے ہل گئے۔ فہمیدہ نے اس بیقراری میں جو بیان کئے ان کے لکھنے سے پہلے قلم کا سینہ شق ہے اور چشم دوات سے اشک جاری ہیں۔ خلاصہ یہ کہ فہمیدہ کے قلق و اضطراب نے محلے میں حشر برپا کر دیا۔ اگرچہ نصوح گریہ و بکا کی آواز سُنکر کھٹکا تھا مگر وہ اس طرح کا مستقل مزاج ضابط آدمی تھا کہ اُسی زنبیل[1]

---

[1] ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔

کے ساتھ معمولی تلاوت کو پورا کیا اور اُس کے بعد نیچے اُتر کر باہر پالکی کے پاس آیا۔ فہمیدہ کا رونا سُن کر اور بیٹے کی روی حالت دیکھ کر بے اختیار اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو چلے جاتے تھے اور بار بار ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرتا تھا مگر نہ کچھ بولتا تھا نہ چالتا تھا۔ آدھ گھنٹے کامل اُس کی یہی کیفیت رہی اس کے بعد اُس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا " اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ - لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلَیْہِ سَکَرَاتِہٖ وَکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ -

اس کے بعد بی بی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں تم کو رنج کرنے سے منع نہیں کرتا۔ تمھارا رنج ایک اقتضائے طبیعت ہے کہ انسان اس میں مجبور ہے لیکن مجھ کو تمھارا اضطرار دیکھ کر اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ مبادا تمھارے خیالات منجر بکفران ہو جائیں۔ اگر مصیبت کے وقت انسان کے دل میں نعوذ باللہ، بوئے نارضامندی بھی خداوند بے نیاز کی طرف سے پیدا ہو تو پھر کہیں اُس کا ٹھکانا نہیں۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ۔ کیا ہم نئے آدمی اور یہ انوکھی مصیبت ہے۔ بزرگانِ دین پر اس سے

لے ہم اللہ کے ہیں اور سب اُسی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ گناہ سے بچنا اور نیکی پر قدرت پانا خدائے بزرگ و برتر کی مدد کے بدون نہیں ہو سکتا۔ میں تو اپنے رنج و غم کی فریاد خدا ہی سے کرتا ہوں۔ اے خدا ہم پر صبر کا مینھ برسا اور ہم کو ثابت قدم رکھ، اے خدا اس پر جان کنی آسان کر اور اس کے گناہوں کو اس سے جھاڑ ڈال۔ ؎ داخلِ ناشکری۔ ؎ دنیا اور دین میں ٹوٹا پایا اور یہ بڑا خسارہ ہے۔

کہیں زیادہ مصیبتیں نازل ہوئیں۔ زندہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیئے گئے۔ سر پر آرے چلے۔ سولی چڑھے۔ قتل ہوئے۔ قید رہے۔ ماریں پڑیں۔ کوڑے سہے۔ گالیاں کھائیں۔ بیگاریں بھگتیں۔ ذلّتیں اٹھائیں۔ رُسوائیاں جھیلیں مگر خدا اُن کو جزائے خیر دے، کیسے سچّے بندے تھے کہ رضا و تسلیم کے حبلِ متین[1] کو ہاتھ سے نہ دیا۔ یہ کچھ مصیبت اور دل برضاجوئی حضرت ربوبیت[2]۔ یہ کچھ ایذا اور زبان سپاس گزارِ منت۔ شکر کا مقام ہے کہ خداوند کریم نے ہمارے ضعف پر رحم فرما کر امتحان سخت میں مبتلا نہیں کیا اگر بندہ صرف یسر[3] و رفاہ کی حالت میں خدا سے راضی ہے اور تکلیف و اذیت میں شاکی، تو وہ بندہ "بندۂ خدا نہیں بلکہ بندۂ غرض اور مطلب پرست ہے۔ اے بی بی رنج کرو لیکن صبر کے ساتھ اور مصیبت پر رو و مگر شانِ عبودیت لئے ہوئے۔ دُنیا میں جتنی ایذا اور جتنی مصیبت ہے پاداشِ گناہ و وبالِ معصیت ہے۔ اسی واسطے توبہ و استغفار کو لکھا ہے کہ اُس سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ سب سے بہتر ہمدردی جو ہم اس شخص کی اس تباہ حالت میں کر سکتے ہیں، یہ ہے کہ اُس کے گناہوں کی معافی کے لئے خداوند کریم کے حضور میں منّت و سماجت دُعا کریں، یہ شخص تم بھی اس بات کو تسلیم کرو گی اپنے ہاتھوں اس نوبت کو پہنچا کہ جو اس کو دیکھے گا باقتضائے انسانیت تاسف کرے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں تمام دُنیا کا رحم خدا کی رحمتِ کاملہ کے آگے ہزارواں لاکھواں حصّہ بھی نہیں ہے اگرچہ ہم لوگوں کے دیکھنے میں

[1] مضبوط رسی [2] خدائی [3] آسانی اور نفع۔

اُس کی حالت بہت ہی زبوں ہے لیکن کوئی شخص اس سے بڑھ کر خوش قسمت نہیں، اگر اس کی یہ تکلیفیں عند اللہ اس کے گناہوں کا کفّارہ سمجھی جائیں۔ نصوح کے وعظ کا سحر حلال ایسا نہ تھا کہ کوئی اُس کو سنے اور متاثر نہ ہو۔ فہمیدہ فوراً منھ پونچھ سیدھی ہو بیٹھی اور اب میاں بی بی لگے آپس میں صلاح کرنے کہ کیا کیا جائے؟

نصوح۔ اس کو محلّے کے شفاخانہ میں پہنچا دینا چاہیئے۔ ہر وقت ڈاکٹر کے پیش نظر رہے گا۔ مکان بہت پُر فضا ہے اس کی طبیعت کو بھی تفریح ہوگی۔

فہمیدہ۔ ہے ہے، اور میرا دل کیونکر صبر کرے گا؟

نصوح۔ تمھارا یہ کہنا بھی واجب ہے مگر بیمار کی حالت ایسی ردی ہے کہ کسی وقت اس سے طبیب کا مفارقت کرنا مناسب نہیں۔

فہمیدہ۔ حکیم جی شوق سے آئیں جائیں میں سہ دری میں پردہ کئے بیٹھی رہوں گی۔

نصوح۔ زخموں کا علاج کچھ ڈاکٹروں ہی سے خوب بن پڑتا ہے۔ یونانی طبیب تو اس کوچے سے محض نابلد ہیں۔ رہے جرّاح ان کو دو چار مرہم ضرور معلوم ہیں، مگر تشریح سے جیسے یونانی طبیب بےخبر۔ ویسے ہی جرّاح ناواقف۔ بہتر ہوگا کہ اس کو نعیمہ کے گھر لے چلیں۔ سرکاری شفاخانہ بھی قریب ہے اور میاں عیسیٰ کہ اس وقت ہندوستانی جرّاحوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ دیوار بیچ اُن کا گھر ہے۔

فہمیدہ نے بھی اس صلاح کو پسند کیا اور کیسا سامان کس کی تیاری گھر کا گھر کلیم کی پالکی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یہاں سے کوئی چھ سات پیسے ڈولی نعیمہ کی سسرال تھی۔ کہاروں نے پالکی اُٹھائی تو کہیں کاندھا تک نہیں بدلا۔ دُھر نعیمہ کے گھر جا اُتاری۔ یاد ہوگا کہ نعیمہ ماں سے لڑکر بے ملے صالحہ کے ساتھ خالہ کے یہاں چلی گئی تھی پھر چار مہینے وہاں رہی، نیک لوگوں کے ساتھ رہنے کی برکت سے خدا نے اُس کو ہدایت دی اور وہ بھی نیک بن گئی ۔

سگِ[1] اصحابِ کہف روزے چند   پئے نیکاں گرفت و مردم شد

نیک بنے پیچھے ممکن نہ تھا کہ وہ ماں باپ کی ناراضامندی گوارا کرتی۔ اُس نے ماں باپ کو شاد اور خدا نے اُس کو اپنے گھر میں آباد کیا۔ اُس کو سسرال گئے دوسرا مہینہ تھا کہ کلیم کو چار کہاروں کے کندھوں پر لاد کر اُس کے گھر لے گئے۔ چونکہ نعیمہ کے گھر آباد ہونے کا تذکرہ آگیا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نعیمہ کا حال لکھا جائے اور کلیم کو جو دنیا میں اب مہمانِ چند روزہ ہے پیچھے دیکھ لیا جائے گا۔

---

[1] اصحابِ کہف کے کُتے نے چند روز نیکوں کا پیچھا کیا تو وہ آدمی ہو گیا۔

12

فصل دوازدہم

نعیمہ خالہ کے یہاں رہ کر خود بخود درست ہو گئی اس نے ماں باپ سے اپنی خطا معاف کرائی اور خدا نے اُس کا مدتوں کا اُجڑا ہوا گھر پھر آباد کیا کلیم نے بہن کے گھر وفات پائی۔ قصّے کا خاتمہ

نعیمہ اور کلیم اس اعتبار سے دونوں کی کچھ ایک ہی سی کیفیت تھی کہ زیادہ عمر ہو جانے کی وجہ سے عادتیں دونوں کی راسخ ہو چکی تھیں۔ بیاہے ہوئے اور صاحب اولاد دونوں تھے۔ کلیم کو بی بی سے کچھ اُنس نہ تھا تو نعیمہ کا شوہر سے بگاڑ تھا۔ نعیمہ اگرچہ کلیم کی طرح سب میں بڑی نہ تھی مگر بڑی بیٹی تھی۔ لیکن پھر بھی کلیم فولاد تھا تو نعیمہ اُس کے مقابلہ میں سیسا بلکہ رانگا سمجھنا چاہیے۔ کلیم مرد تھا۔ قسی القلب[1]۔ نعیمہ عورت، نرم دل۔ کلیم باہر کا چلنے پھرنے '' سیکڑوں آدمیوں سے تعارف، ہزاروں سے

[1] سخت دل۔

جان پہچان۔ نعیمہ بیچاری پردے کی رہنے والی میل ملاپ سمجھو تو اور پیار اخلاص سمجھو تو ماں بہن خالہ نانی کنبے کی عورتوں سے وہ بھی گنتی کی۔ کلیم اور نعیمہ دل دونوں کے بیمار تھے۔ لیکن کلیم کے دل کو ذاتی روگ کے علاوہ صدہا بیماریاں اس قسم کی تھیں جو متعدی کہلاتی ہیں یعنی ایک سے اُڑ کر دوسرے کو لگ جاتی ہیں پس کلیم کے مزاج میں چند در چند خرابیاں تھیں جو اُس نے بُری صحبتوں میں بیٹھ کر اپنے پیچھے لگائی تھیں۔ نعیمہ میں جو کچھ بُرائی تھی وہ ماں باپ کے لاڈ پیار علم کی ناداری اور عقل کی کوتاہی کی وجہ سے تھی۔ کلیم دلیر و بیباک اور عیار و چالاک تھا۔ نعیمہ بیوقوف بھولی اور ڈرپوک دل کی بودی۔ کلیم کے سر پر ایک سخت بلا مسلّط تھی یعنی اُس کے جلیس و ہمنشیں اور نعیمہ اُس سے بالکل محفوظ تھی۔ کلیم میں اس قسم کے بیہودہ عیوب تھے جن میں آج کل کے کمبخت نوجوان شریف زادے کثرت سے مبتلا پائے جاتے ہیں یعنی عورتوں کی طرح در پے تحسین رہنا اور بناؤ سنگھار کھنا پہر دن چڑھے سو کر اٹھے۔ ضرورتوں سے فارغ ہو کر آئینہ کی تلاوت شروع ہوئی تو دوپہر کر دیا۔ اگرچہ رات کو مانگ اور پٹیوں کے لحاظ سے رومال باندھ کر اور سر کو الگ تھلگ رکھ کر سوئے تھے مگر آئینہ میں منھ دیکھا تو زلف کی پریشانی پر اس قدر تاسف کیا کہ سر اسحاق نیوٹن صاحب نے بھی اپنے اوراق کی ابتری پر اتنا افسوس نہ کیا ہوگا۔ یارے اگر اصلاح کا دن نہ ہوا تو گھنٹوں کی محنت میں وہ بھی اپنے اکیلے کی نہیں، بال ٹھکانے لگے اور مانگ درست ہوئی اور کہیں اصلاح کا روز منحوس ہوا تو سارا دن گزر گیا

ایک وضع خاص پر سر جھکائے گردن شل ہوگئی۔ داڑھی اور مونچھوں کے ترشوانے میں منھ کو لقوہ مار گیا۔ حجام کی آنکھوں کے تلے اندھیر آنے لگا مگر پھر بھی اُن کا خط خاطر خواہ نہ بنا۔ کپڑے بدلنے کی نوبت پہنچی۔ ٹوپی قالب سے اُتر کر آئی تو سر پیٹ لیا مگر ایسی احتیاط سے کہ بال نہ بگڑیں۔ اس کے بعد انگرکھے کی چنٹ پر چیں بجبیں ہوئے پھر تو ادھر انگرکھے کی آستینوں اور اُدھر پائجامہ کی تنگ مہریوں کے ساتھ ہاتھا پائی ہونی شروع ہوئی۔ مشکل یہ آ کر پڑی کہ کپڑا ایسا مہین کشاکش کا متحمل نہیں۔ ذرا زور پڑا اور مسکا اور ہاتھ پاؤں کہتے ہیں کہ ہم ان چیونٹی کے بلوں میں گھسنے کے نہیں۔ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ[1]۔ بارے کاغذ کے سہارے سے ہولے ہولے۔ پھسلاتے پھسلاتے کہیں پہروں میں جا کر مشکل آسان ہوئی۔ اب ملبوس خاص زیب تن تو ہوا مگر کس کیفیت سے کہ تنگی اور چستی کے مارے مشکیں الگ کسی ہوئی ہیں۔ پاؤں علیحدہ جکڑے ہوئے ہیں اور سارا بدن گویا شکنجہ میں ہے۔ کھانسنا چھینکنا۔ جمائی۔ انگڑائی تو درکنار گھنڈی تکمے کے لحاظ۔ بندوں کے پاس خاطر سے اچھی طرح سانس بھی نہیں لے سکتے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ لباس سے غرض اصلی بدن ڈھانکنا اور آسائش پہنچانا ہے۔ اُس میں کبر و نخوت کو دخل دے کر کیا ناس مارا ہے کہ غرض اصلی گئی گزری ہوئی اور تکلیف و ایذا الٹی گلے مڑھی گئی۔ مقصود تھی پردہ پوشی ان بزرگ ذات نے اُس میں تراش خراش اور وضعداری کو ایسا شامل کیا کہ کپڑوں نے

[1] یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نکل جائے۔

اندرون دل تک کا لفافہ اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اب اُن کے حالات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صورت بہیں حالش مپرس۔ کلیم بھی ایک اسی طرح کا چھیلا تھا بدوضع آوارہ۔ جس کے اطوار و عادات جا بجا لکھے جا چکے ہیں۔ اس خصوص میں نعیمہ شرفا کی بہو بیٹیوں کی طرح کالدُّرِّ المکنون[1] محفوظ و مصؤن تھی اس میں اور کلیم میں بے مبالغہ فرشتہ اور شیطان کی نسبت سمجھنی چاہیئے۔ غرض نعیمہ کا روبراہ ہونا دشوار ضرور تھا اور کلیم کی طرح محال مشکل البتہ تھا لیکن نہ کلیم کے مانند متعذر[2] خالہ کے یہاں ڈولی سے اُتری تو جوں ہی خالہ کی شکل دُور سے نظر پڑی کہ بھُوں بھُوں رونا شروع کیا (دیہات کی مستورات کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی مہمان یا مسافر بہت دنوں کے بعد آتا ہے تو اُس سے مل کر رونے لگتی ہیں اس واسطے کہ اس وقت اُن کو مفارقت کی سختیاں اور تکلیفیں اور یادگاری اور انتظار کی زحمتیں یاد آتی ہیں۔ مگر دہلی کا یہ دستور نہیں ہے۔ یہاں کی عورتیں اُسی حالت میں روتی ہیں جبکہ طرفین میں سے کسی کا کوئی عزیز و قریب زمانِ جدائی میں مرگیا ہو۔ ورنہ یوں مہمان و مسافر کے آنے پر رونا دلی والیاں منحوس سمجھتی ہیں) گو خالہ کو دیکھ کر نعیمہ کے دل میں جوش پیدا ہوا تھا مگر اُس کو ضبط کرنا چاہا تھا لیکن نہ تو نعیمہ کو اتنی عقل تھی کہ اتنی بات سمجھتی اور شاید سمجھی بھی ہو۔ تاہم وہ دل پر اس قدر ضابطہ نہ تھی۔ خالہ نے جو اُس کو روتے دیکھا سخت تعجب کیا۔ بھانجی کی عادت سے واقف تھیں، سمجھ تو گئیں کہ ماں سے روٹھ کر آئی ہے۔ اُسی کا یہ رونا ہے۔ لیکن جلدی سے

[1] احتیاط اور نگرانی میں رکھا ہوا موتی [2] دشوار تر

دَوڑ بھانجی کو گلے لگا لیا اور پیار چمکار کر بہت کچھ تسلّی دی اور سمجھایا کہ اللہ رکھے بیٹے کی ماں ہوئیں، اب تمھاری عمر بچوں کی طرح رونے کی نہیں ہے۔ ہمسایہ کی عورتیں سُنیں گی تو کیا کہیں گی۔ جانے دو۔ بس کرو۔ طبیعت کو سنبھالو۔ جی کو مضبوط رکھو۔

نعیمہ۔ "امّاں جان نے مجھے مارا۔" اُوں اُوں۔"

خالہ۔ مارا تو کیا ہوا۔ ماں باپ ہزار بار پیار کرتے ہیں تو نصیحت کے واسطے مار بھی بیٹھتے ہیں۔ ماں باپ کی مار مار نہیں، سنوار ہے، تمھاری نانی خدا جنّت نصیب کرے بڑی ہتھ چھٹ تھیں۔ تم اس بات کو سچ ماننا کہ اب ہم اُن کی مار کو ترستے ہیں۔ ماں باپ کی مار کیا ہر ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ جنھیں خدا کو بہتر کرنا منظور ہوتا ہے وہ ماں باپ کی مار کھاتے ہیں۔ بھلا تم نے اس بات کا خیال کیا۔ ہوش میں آؤ۔ لو دیکھو تمھارا بیٹا بھی تمھارے رونے پر ہنستا ہے۔ (ننھے بچے کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں جی بڑے میاں تم کچھ اپنی امّاں جان کو نہیں سمجھاتے؟

بچہ۔ آغوں۔

خالہ۔ آغوں غوٹے، دودھ پی پی کر میاں ہوئے موٹے۔

غرض خالہ نے نعیمہ کے رونے کو باتوں میں ٹال دیا۔ چندے نعیمہ جھینپتی سی رہی مگر پھر تو ہنسی خوشی رہنے لگی۔ اگرچہ خالہ نے بھانجی سے رونے کا سبب مصلحۃً نہیں دریافت کیا مگر موقع سے صالحہ کو الگ لے جا کر ساری حقیقت پوچھی اور تب اُس کو بہن کے گھر دینداری کی چھیڑ چھاڑ کا ہونا

معلوم ہوا تو اُس کو اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی اور مصمم اُس نے ارادہ کرلیا کہ جب تک نعیمہ کو پکی دیندار نہ بنا دے گھر سے رخصت نہ کرے۔ خالہ کے گھر رہ کر نعیمہ کی عادتوں کا خود بخود درست ہوجانا عمدہ مثال ہے اس کی کہ صحبت سے بڑھ کر تعلیم کا کوئی اچھا طریقہ نہیں۔ ماں کے گھر چند خاص باتیں نعیمہ کی اصلاح میں خلل انداز تھیں اول تو اُس نے ماں اور تمام خاندان کو بیدینی کی حالت میں مدتوں زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پس بالضرور اُن کی نصیحت کو وہ وقعت نہیں ہوسکتی تھی جو یہاں خالہ کی باتوں کو تھی۔ دوسرے ماں کے گھر بھائی بہن نوکر چاکر، پاس پڑوس والے کتنے لوگ تھے جو نعیمہ کو ابتدائے عمر سے ایک طرز خاص پر دیکھ چکے تھے۔ نعیمہ کو اُن کے روبرو طرز جدید، اور جدید بھی کیسا کہ طرز سابق سے مخالفت اختیار کرتے ہوئے عار آتی تھی۔ تیسرے ماں کے یہاں اتفاق سے اس کو ایک سختی بھی پیش آگئی تھی اور وہ سختی اُس کی حالت کے کسی طرح مناسب نہ تھی۔ چوتھے اُس کو ماں پر بڑا ناز تھا یعنی اُن کی خدمت میں شدت سے گستاخ تھی اور اُن کے کہنے کی مطلق پروا نہیں کرتی تھی۔ خالہ کے یہاں آکر رہی تو کسی نے بھول کر بھی اس سے تذکرہ نہ کیا کہ دینداری بھی کوئی چیز ہے یا خدا کی پرستش بھی انسان کا ایک فرض ہے مگر تھا کیا کہ چھوٹے بڑے سب ایک رنگ میں تھے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً[1] اور اُن کی تمام حرکات و سکنات شان دینداری لئے ہوئے تھیں

[1] خدا کا رنگ، اور اس کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے؟

اُن کی نشست و برخاست اُن کی رفتار و گفتار، اُن کا قول و فعل اُن کی بات چیت اُن کا میل جول اُن کا لڑائی جھگڑا۔ اُن کا کھانا پینا۔ اُن کی خوشی اُن کا رنج کوئی ادا ہو وہ ایک نرالی دیندارانہ ادا تھی۔ نعیمہ کو خالہ کا گھر ایک نئی دنیا معلوم ہوتا تھا اگرچہ ابتداءً وہ یہاں کے اوضاعؔ[1] کو حقارت سے دیکھتی تھی لیکن جوں جوں وہ ان دستورات سے مانوس ہوتی گئی اُن کی عمدگی اور بہتری اُس کے ذہن میں بیٹھتی گئی۔ آخر اُس کو ثابت ہوا کہ بیدین زندگی محض ایک بے اطمینان بے سہارے زندگی ہے اگر رنج و ایذا ہے تو کوئی وجہ تسلّی کوئی ذریعۂ تشفی نہیں اور اگر آرام و خوشی ہے تو اُس کو ثبات و قرار نہیں۔ فاقہ ہے تو صبر نہیں کھانا ہے تو سیری نہیں بدی کی سزا نہیں۔ نیکی کی جزا نہیں۔ بیدین آدمی ایسا ہے جیسے بے نکیل کا اونٹ۔ بے ناتھ کا بیل۔ بے لگام کا گھوڑا بے ملاح کی ناؤ۔ بے رگیولیٹر کی گھڑی۔ بے شوہر کی عورت۔ بے باپ کا بچہ۔ بے تھیوے کی انگوٹھی۔ بے لالی کی منہدی۔ بے خوشبو کا عطر۔ بے باس کا پھول۔ بے طبیب کا بیمار۔ بے آئینہ کا سنگھار یعنی دین نہیں تو دُنیا اور مافیہا سب ہیچ اور عبث اور فضول اور پوچ اور پچر ہے۔ نعیمہ نے رفتہ رفتہ خود بخود خالہ کی تقلید شروع کی کہ وہ ہمیشہ پہر سوا پہر دن چڑھے سو کر اٹھتی تھی اور یہاں گھر بھر چھوٹے بڑے مُنھ اندھیرے اُٹھ، ضرورتوں سے فارغ ہو عبادت الٰہی میں مصروف ہوتے تھے گھر بھر کا اُٹھنا اور وہ بھی نرا اُٹھنا اور چارپائیوں پر

[1] جمع وضع کی یعنی ڈھنگ ۱۲

• بیانیہ شاعری کے لئے کون سی صنف کارآمد ہے۔

• شعر العجم کی کتنی جلدیں ہیں۔

(۱) اب کے مبر العید و دل
دشمنوں کی زد پہ ہے

(۲) پھر مدد کو ابابیلوں
کے لشکر بھیجنا

حکیم منظور